زوار
حسن رضا گردیزی

ارزانی یہ آدم کی

حسن رضا گردیزی

بیکن بکس ۔ گلگشت ملتان

بار دوم ——— ۱۹۸۹ء

مطبع ——— ندیم شفیق پرنٹنگ پریس ملتان

خوشنویس ——— رحمت علی انصاری

قیمت ۵۰ روپے

بیکن بکس ——— گلگشت ملتان

انتساب

سردار غلام شبیر خانؒ بربرا

کے نام

جو اپنے ذوقِ ادبؔ اور بے لوث
عقیدت کی بنا پر میؔری زندگی کے
طویل اور بے کیف لمحات میں میرے
لئے باعثِ دل بستگی رہے،

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل ؟
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی ؟

اقبالؔ

آدم کی یہ ارزانی

تاثّرات

عاصی کرنالی

میرے لئے اِس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے کہ میں جناب حسن رضا گردیزی کے افسانوں پر اپنے تاثرات لکھ رہا ہوں۔

جناب حسن رضا گردیزی اپنی خاندانی نجابت، اپنی ذاتی شرافت اور اپنی علمی وادبی بصیرت کے سبب ایک ارفع مقام پر فائز ہیں۔ اُن کی شخصیت مُلتان کے ادب وثقافت کی ایک واضح شناخت ہے۔ وُہ اُردو، فارسی اور سرائیکی کے ایک معروف وممتاز ادیب ہیں۔ شاعری اور نثر میں اُن کا اپنا ایک اُسلُوب ہے۔ الغرض وُہ ایک مفتخر، معتبر اور مقتدر شخصیت ہیں۔

جناب حسن رضا گردیزی نے افسانے کی صنف پر قلم اُٹھایا ہے۔ اور کوئی اٹھارہ افسانے قلم بند کئے ہیں۔ مَیں نے ان افسانوں کو نہایت دِلچسپی، غور وفکر اور دقّتِ نظری کے ساتھ پڑھا ہے اور جو تاثّر میرے ذہن میں قائم ہُوا ہے اُسے حوالۂ قرطاس کر رہا ہُوں!۔

یہ افسانے اپنی تخلیق کا ایک وسیع اور واضح پس منظر رکھتے ہیں۔ صاحبِ تصنیف کو اپنی معاشرتی اور معاشی زندگی میں بیکراں مُشاہدات کا موقعہ مِلا ہے۔ بہت سے واقعات جن سے اِن افسانوں کا مواد چُنا گیا ہے یقیناً مصنف کے ذاتی تجربوں سے گُزر کر اُن کے قلبی محسُوسات اور دِلی واردات کا ایک حصّہ بنے ہیں۔ ہر افسانے کے پس پردہ ایک ایسی "واقعیت" نظر آتی ہے۔

جس نے مصنّف کے ذہن کو کیفیّت و احساس کے ایک خاص سانچے ڈھال دیا ہے اُن میں ایک ایسی درد مندی، ایک ایسی دِلی رقت، دُکھ اور اذیت ایک ایسا احساس پیدا کر دیا ہے کہ یہ افسانے اُن کے ذہنی کرب کا ایک بے ساختہ اظہار بن کر نوکِ قلم سے ٹپک گئے ہیں۔ مجھے افسانے پڑھتے ہُوئے یُوں محسوس ہُوا کہ گویا محسُوسات کا ایک تیز دھار خنجر اُن کے دل میں گڑ گیا ہے۔ اُن کا دِلِ خوں گشتہ قطرہ قطرہ اور بُوند بُوند اُن کے قلم پر آ رہا ہے اور کاغذ کو خُوں رنگ کر رہا ہے ——— یہ افسانے تخلیقی کرب کے مرحلوں سے گُزر کر آئے ہیں اس لیئے ان کی سطر سطر لہُو کی لکیر ہے اور ان کا لفظ لفظ قطرۂ اشکِ خُوں ہے ——— یہ افسانے لکھتے ہُوئے وُہ جس ذہنی قیامت سے مسلسل گُزرے ہیں اگر یہ مُجھ پر ٹوٹتی تو میرے دِل کی رگیں ٹُوٹ جاتیں یا میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جاتیں! ———

اصل میں شاہ صاحب قلم کے جس قبیلے اور لطافتِ احساس کے جس زُمرے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں پہنچ کر انسان خواب دیکھنے کا بہت عادی ہو جاتا ہے یا یُوں کہیئے کہ بہت سی اُونچی توقّعات باندھنے لگتا ہے۔ مثلاً یہ کہ یہ دُنیا سراسر نیکیوں کا گہوارہ، راحت و شادمانی کا چمن اور عدل و مُحبت کا بہارستان بن جائے۔ یہاں ہر شخص کے ہونٹوں پر مُسکراہٹیں اور آنکھوں میں طمانیتِ قلب کی چمک ہو۔ یہاں اتنے اُجالے، اتنی روشنیاں ہوں کہ اندھیرے کا ایک ذرہ باقی نہ رہے۔ یہاں مُحبت کی اتنی بارشیں ہوں کہ دلوں میں ذرا سی گردِ کثافت اور چہروں پر ذرا سا غبارِ کدورت نظر نہ آئے۔ یہ دُنیائے انسانیت ایک ایسی جنت میں بدل جائے جہاں خُورشید و مہتاب مسرتوں کا نُور برسائیں اور جہاں ماہ و سال اور شب و روز کے دامن سے رحمتوں، برکتوں، سعادتوں اور بشارتوں کے پھُول ہماری پیشانیوں کو چُومتے ہُوئے ہمارے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں! ———

مصنف ایسے معاشرے کے خواب دیکھتا ہے جہاں اخلاقی قدروں کا تحفظ ہو۔ جہاں حُسن ہو، خیر ہو، صداقت ہو۔ جہاں جھُوٹ، فریب اور منافقت کے اندھیرے نہ ہوں۔ جہاں کی صُبحوں پر جبر و ستم، جور و بیداد، اور ابلیست و شیطنت کی شبِ سیاہ اپنے مہیب سایے دراز نہ کرے۔ جہاں ریاکاری، دین فروشی، اور تلبیس نہ ہو۔ جہاں بادشاہ اپنی رعیت پر، حاکم اپنے محکُوم پر، زمیندار اپنے مزارع پر، آجر اپنے اجیر پر موسمِ گرما کی ٹھنڈی چھاؤں کی طرح مہربان اور موسمِ سرما

کی گرم دُھوپ کی طرح شفیق ہو۔ جہاں دین محترم ہو، شریعت مقتدر ہو، عدل و اخلاق کا اعتبار قائم ہو۔ رشتوں کی حُرمتیں محفوظ ہوں۔ جہاں کوئی ہوس کار کسی معصوم لڑکی کو میلی نگاہ سے نہ دیکھے۔ جہاں سروں پر ردائے عصمت کی حفاظت کی جائے۔ جہاں کی محفلیں مقدس ہوں اور جہاں کی خلوتیں متبرک! لیکن ان تمام خوابوں، اُمیدوں، آرزوؤں اور تصورات کے برعکس اُس کے دل و نظر کے سامنے جو دردناک اور رُوح فرسا مناظر گزرتے ہیں وُہ ایک قاتل احساس بن کر اُس کو مار ڈالتے اُس کے خواب ریزہ ریزہ، اُس کا دل پارہ پارہ اور اُس کی رُوح زخم زخم ہو جاتی ہے تب وُہ افسانے لکھتا ہے اور اپنے سارے زخموں، اپنے دل، دماغ اور رُوح کی ساری قاشوں کو کاغذ پر بکھیر دیتا ہے! ———

اِن اٹھارہ افسانوں کا صِرف ایک مزاج، صِرف ایک فضا ہے۔ یا یُوں کہیئے یہ ایک ہی لمبی داستان ہے جسے اٹھارہ ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ان کا ایک ہی موضُوع بنتا ہے۔ "جبر اور منافقت کے خلاف احتجاج" ——— ان افسانوں میں یا جبر کی خُونیں داستانیں رقم کی گئی ہیں یا منافقت کے سفاک مناظر کو مجسّم کیا گیا ہے۔ جبر کے تحت ایک طاقت ور اور سرمایہ دار طبقہ غریبوں، اور بے بسوں پر ظُلم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ کسانوں، مزدُوروں اور محنت کشوں کا استحصال ہوتا ہے۔ اُن کے روزی کے وسائل، ان کے رہنے کے ٹھکانے، اُن کی محدُود زمینیں اُن سے چھین لی جاتی ہیں۔ اُن کی معصُوم کنواری لڑکیوں کی ناموس و آبرُو کے آبگینے چکنا چُور کر دیئے جاتے ہیں۔ تتلیوں، فاختاؤں اور غزالانِ عصمت کو ذبح کر دیا جاتا ہے! ——— جبر کے بہت سے چہرے ہیں، بہت سے رُوپ بہروپ ہیں۔ کہیں یہ جبر اپنی اصلی قہار صُورت میں زلزلہ افگن ہے اور کہیں نقاب پوش اور پس پردہ اپنی جبّاری و قہّاری کا دوزخ بھڑکا رہا ہے۔ مظلُومیت اور مجبُوری سر برہنہ بلکہ تن برہنہ سینہ کوباں اور ماتم کناں ہے اسے کہیں اِنصاف نہیں ملتا۔ داد رسی نہیں ہوتی کیُوں کہ عدل و اِنصاف کے مدعی اور قانون نافذ کرنے والے ادارے خُود اِس جبر کا حصّہ ہیں اور فرعونوں، ہامانوں اور شدّادوں اور نمرودوں کے ریزہ چیں ہیں! ———

اِسی طرح منافقت کا اپنا ایک قہر ہے جو اِس طرح ٹُوٹا پڑتا ہے جیسے عذاب قیامت! یہاں جس منظر کو دیکھئے اُس میں دو رنگی۔ جس شخص پر نظر ڈالیئے اُس میں دو روئی۔ ظاہر و باطن کا تضاد۔

راہبر کے پردے میں رہزن۔ محافظِ دیں کی آڑ میں غارت گرِ دین وایماں، چہرہ بھیڑ کا نفس بھیڑیے کا، صُورت اِنسان کی، سیرت حیوان اور شیطان کی۔ یہاں کی ہر خوبصُورتی کی اوٹ میں انتہائی مکروہ بدصُورتی۔ ملعوُن بدہیئتی پنہاں ہے۔ یہاں، منافقت کی اِس خوفناک دُنیا میں عفریت ہیں، آسیب ہیں، بلائیں ہیں، چڑیلیں ہیں، درندے ہیں، بچھّو ہیں، اژدھے ہیں یعنی اِنسان کے سوا ہر آدم آزار مخلوق یہاں اپنے دام ہائے دجل وفریب پھیلائے اپنے نوکیلے پنجے تیز کیے، اپنے دندانِ آز کھولے بیٹھی ہے اور تمام قدروں کو، شرافتوں کو اور معصومیتوں کو جکڑ رہی ہے نگل رہی ہے!——

جناب حسن رضا گردیزی نے اِسی ذہنی فضا میں سارے افسانے لکھے ہیں اور یہی منفی پہلوُ آشکار کیا ہے۔ اِس کے لِئے اُنہیں تقابلی مناظر پیش کرنے پڑتے ہیں جن میں ہر دو طبقوں کے افراد کو نمائندگی ملتی ہے ایک جبر کرنے والا۔ ایک جبر سہنے والا۔ یا ایک منافقت کرنے والا اور ایک منافقت کے جال میں پھنس کر پھڑ پھڑانے بلکہ ہلاک ہونے والا!——
اِس طرح یہ کہانیاں جبر ومنافقت کے حوالے سے دو طبقوں کے تضاد و کشمکش کی داستان بن جاتی ہیں اور اِن افسانوں کے زبان وبیاں، مناظر و احوال، واقعات وشواہد اور خُود مصنّف کے دل میں جو کرب وگُداز ہے اُس سے قاری کے دل میں شدید تاثر قائم ہوتا ہے وُہ بھی مُصنّف کے اس خواب اور اِس آرزُو میں شریک ہوجاتا ہے کہ اس نظامِ جبر اور اِس محشرِ منافقت کو ختم ہونا چاہیئے۔ بدکاروں کو اُن کے اعمالِ سیاہ کی مکافات ملنی چاہیئے اور مظلوُموں کی دادرسی، حق رسی اور تحفظ ہونا چاہیئے!—— اب افسانوں کے حوالوں سے گفتگو کا آغاز ہوتا ہے:

بعض افسانے ایسے ہیں کہ اُن کے مرکزی کرداروں کے نام ہی اُن کے عنوان ہیں۔ ایسے تمام کردار باطنی خباثت کے مُرقّع ہیں اور منافقت کی سیاہی سے اِن کے دل تاریک اور ضمیر کثیف ہیں۔ بظاہر اِن کے چہروں پر دین وتقوٰی کا اُجالا اور اِن کی ہیئتِ ظاہری پر الوہی انوار وتجلیات کی روشنی ہے لیکن یہ افراد انسانیّت کی غلاظت گاہیں اور سنڈاس خانے ہیں۔ مولوی کریم اللہ، شیخ نصیرالدینؒ، حافظ جھکّاؤ الدّین، صُوفی نجم الدّین جبّار، پیر سائیں، حاجی صاحب وغیرہ ہمارے معاشرتی وجوُد کے بدبُو دار پھوڑے اور پیپ بھرے ناسُور ہیں۔ ذرا اِن میں سے ایک دو کا تعارف ہو جائے۔
"مولوی صاحب طویل قامت عظیم الجثہ اور شرعی ہیئتِ کذائی کے حامل تھے۔ ان کی قمیص

کے چوتھے بٹن تک پہنچی ہوئی گھنی سیاہ اور چمکدار ڈاڑھی جسے وُہ روزانہ دھو دھاکر معطر کرتے اُن کی وجاہت اور جلال میں اضافہ کرتی تھی۔"

(مولوی کریم اللہ)

"شیخ صاحب بڑے دین دار بزرگ تھے۔ فربہ جسم کشادہ چہرہ اور مُشت بھر ڈاڑھی ان کی نیک باطنی کے شاہد تھے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے پابند اور شہر میں کئی مسجدوں کے بانی تھے۔"

(شیخ نصیر الدین کی قل خوانی)

"صُوفی صاحب نہایت نیک اور عالم فاضل بزرگ تھے۔ صُوفیائے کرام کے زمرے میں ان کی بے حد تکریم کی جاتی تھی، کیونکہ وُہ اپنے سینے میں عشقِ الٰہی سے معمُور اور منوّر دل رکھتے تھے۔"

(صُوفی نجم الدّین جفار)

"حاجی صاحب پارسائی میں منفرد، عبادت گزار، شب بیدار، شرعی احکام کے پابند متشرع، چہرے پر نُور، مذہبی تحریکوں کے سرگرم کارکن۔"

(رقص و نغمہ بنام زہد و تقویٰ)

اسی انداز کے ظاہری اوصاف ان خبیث کرداروں سے نُمایاں ہیں لیکن اِن کے سیاہ باطن کا رُخ دیکھئے کہ مولوی کریم اللہ اپنے ایک شاگرد سے جو مہاجرین کے کیمپ کا منتظم اور امین ہے کہتے ہیں "اگر دو چار فرضی مُردوں کے کفن دلوا دو تو میں اس لٹھے سے اپنا لباس بنوالوں" —— شیخ صاحب کی وفات ایک طویل و عریض سہ منزلہ شیش محل میں ہُوئی جس کے لان میں سینکڑوں موٹریں ٹھہر سکتی تھیں۔ اُنہوں نے ہمسایوں کی زمینوں کو ہڑپ کر کے اپنے مسکن کی توسیع فرمائی۔ حکامِ وقت اور رؤسائے شہر اُن کے قدم بوس تھے۔ اُن کی قل خوانی پر شہنشاہوں کے جشن کا گمان ہوتا تھا۔ صُوفی نجم الدّین جفار کو بہتّر سال کی عُمر میں ایک معصوم لڑکی میں حسنِ حقیقی نظر آگیا۔ وہ لڑکی چودہ سال کی تھی جب ان سے عمروں کے تفاوت کا ذکر کیا گیا تو اُنہوں نے کہا رُوحیں سب ہم عُمر ہیں۔ آخر وُہ اُس حُسنِ معصوم پر دستِ ہوس دراز کرتے ہُوئے عین موقعِ واردات پر پکڑے گئے! ——

یہ چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ یہ سب پیر، شیوخ، صوفیائے کرام انتہائی مکروہ کردار ہیں مریدوں کے دین و ایمان اور مریدنیوں کی عصمت و ناموس سے کھیلتے ہیں۔ یہ لوگ ننگِ اسلام اور ننگِ انسانیت ہیں سید حسن رضا گردیزی نے ایسے مواقع پر کردار نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ موزوں لفظوں کا چناؤ اور کردار کی جزئیات کی تصویر کشی اور ان دوہری شخصیتوں کی سکریننگ اُن کے قلم کا ایک ماہرانہ کرشمہ اور ان کے زبردست مشاہدے اور نفسیات شناسی کا ایک موثر اظہار ہے۔

منافقت کے ان مجسموں کو قلم کی سُولی پر چڑھانے کے بعد جب حسن رضا گردیزی پیکرانِ جبر کو پوست کندہ کرتے ہیں تو اُن کا قلم حیرت انگیز مصوری کرتا ہے وہ حیرت، حسرت اور عبرت کے نہایت زہرہ گداز مناظر تراشتے ہیں "بگو میراثی" میں ایک زمیندار سمندر خاں کے عیش و ہوسکاری کا تذکرہ ہے اس افسانے میں سارے رشتے خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ بہن، بیٹی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ہوس کے ہاتھوں رشتوں کی حُرمتیں اس طرح پامال ہوتی ہیں جیسے ایک گندی نالی ہے جس میں بہت سے فُضول کے اجزا، مل جُل کر تعفّن بھرے گٹر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ افسانہ راجاں میں ایک معصوم کنواری لڑکی جس کی آنکھوں میں روشن مستقبل کے خواب فروزاں ہیں اور جو گھر گرہستی کے خُوبصُورت سپنے دیکھ رہی ہے ایک زمیندار کا لڑکا Rape کر دیتا ہے۔ وُہ حاملہ ہو جاتی ہے اور اسقاطِ حمل کی دوا سے ہلاک ہو جاتی ہے۔ ماں باپ کی داد فریاد پر قبر کُشائی ہوتی ہے۔ اسقاط کا جُرم ثابت ہو جاتا ہے۔ باپ کو جیل بھیج دیا جاتا ہے اور قانُون کے محافظ ماحضر تناول کرنے کے لیے نمبردار کے ڈیرے پر چلے جاتے ہیں۔ مہمان نوازی میں ایک لڑکا اور لڑکی سماج کے نظامِ جبر کی زنجیر توڑ کر گھر سے نکلتے ہیں تاکہ کہیں اور جا کر شادی اور آبرومندی کی زندگی گزاریں۔ اجنبی شہر میں ایک بُزرگ شخص اُنہیں ایک غریب پرور نواب کے دولت کدے پر پہنچا دیتا ہے۔ نواب لڑکے کو بڑی تنخواہ پر مُلازم رکھ لیتا ہے۔ لڑکی کو زنان خانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ رات کو لڑکی کی عزت لُٹ چکی تھی ـــــ ماحول میں بادشاہ ایک شکار کے دوران رستہ بھٹک کر ایک دہقان کی جھونپڑی میں جا پہنچتا ہے۔ دہقان کی خوبصُورت لڑکی پر اُس کا دل آجاتا ہے وُہ اُس کے ساتھ شرعی نکاح کرتا ہے اور اس کے ساتھ شبِ عیش گذار کر صبح واپس چلا جاتا ہے۔ لڑکی ملکہ عالم بننے کے خواب دیکھتی ہے اور جب کُچھ عرصے کے بعد اُس کا باپ اُسے شاہی محل میں لے جاتا

ہے تو اس کا وزیر ایک نئی منطق جھاڑ کر اُنہیں دربار سے نکال دیتا ہے الغرض جبر کا براہِ راست شکار مقدس اور آبرو مند لڑکیاں ہیں۔ رشتوں کی یہ پامالی اور جابروں کی یہ ہوس رانی نہ معلوم کتنے ناشگفتہ اور نو دمیدہ غنچوں کو مسلسل دیتی ہے۔ بعض افسانوں میں سید حسن رضا گردیزی نے معاشرے کے اور بہت سے داغ دھبّوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ اور نقاب پوش چہروں کے برص و جذام کو آشکار کیا ہے۔ یہ سب بھی جبر و منافقت کی ذیل میں آتے ہیں۔ شیخ نصیر الدین کی پُرشکوہ قُل خوانی کے موقع پر ہاجرہ کا اکلوتا بیٹا نمونیے سے مرگیا اور ایک نوابزادے نے اپنی موٹر سے ایک گداگر کو کُچل دیا۔ نگہبدارانِ امن نے اسے مرگِ اتفاقیہ قرار دے دیا۔ ویر بھان جیل کا جمعدار ہے۔ غلط آدمی پھانسی پر چڑھ جاتا ہے متعلقہ افسران پریشان ہیں۔ ویر بھان جو ہمیشہ افسروں کے مصائب میں ان کی ڈھال بنتا ہے اس اُلجھن کو حل کر لیتا ہے۔ صحیح آدمی کو پھانسی دے کر، پہلی لاش کو جیل کی ایک کوٹھڑی میں لٹکوا دیتا ہے اور متعلقہ افسران ویر بھان سے تحریری رپورٹ لے کر لکھ دیتے ہیں کہ متوفی نے واقعی خودکشی کی ہے ــــــ

سردارا چپراسی رشوت کے ذرائع اور تدابیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ گلباز خان چرس اور دوسرے نشوں کے جواز پر گفتگو کرتا ہے۔ جیب تراش جیب تراشی کے فن کے اسرار و رموز کھولتا ہے سلیقہ شعاری میں سلمٰی جو خوشحال زندگی بسر کر رہی ہے، بدحال رضیہ کو پیشہ کرانے کی ترغیب دیتی ہے۔ بردباری میں ایک مِل کے مالک کا لڑکا ایک میاں صاحب کی لڑکی کو Rape کرتا ہے وہ بردباری سے تمام واقعات پر پردہ ڈال لیتے ہیں اور لڑکے کو عزت سے رخصت کر دیتے ہیں۔ دوستی میں ایک امیر اور ایک غریب کی حد درجہ رفاقت کے مناظر دکھائے ہیں لیکن جب امیر اپنا کام نکال لیتا ہے تو غریب کو نجس کُتّے کی طرح گھر سے نکال دیتا ہے۔ شاپنگ میں دو عورتیں ٹھگی کرتی ہیں اور ایک ایماندار دکاندار کو جھوٹا قرار دے کر اُس سے مال اور پیسہ ہتھیا لیتی ہیں۔ رقص و نغمہ میں حاجی صاحب ایک مغنیہ سے بنگلے کا سودا کرتے ہیں۔ پچاس ہزار بیعانہ لیتے ہیں اور اگلے دن مُکر جاتے ہیں بنگلہ بھی سلامت اور پچاس ہزار کی آمدنی بھی ــــــ

یہ ایک اجمالی خاکہ ہے چند ایسے واقعات کا جنہیں افسانوں کا مواد بنایا گیا ہے۔ اور نہایت خلوص اور سچائی کے ساتھ اِنسان کی کمینگی کو EXPOSE کیا گیا ہے۔

ہر کہانی کی ہر سطر میں بلکہ ہر لفظ میں افسانہ نگار کی رُوح کی چیخ بند ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہر کاغذ اور ہر صفحہ ایک خُونیں مقتل ہے جہاں جابرین اور منافقین کے ہاتھوں میں تیغ و خنجر اور تیر و تفنگ ہیں اور انسانیت کا قتلِ عام جاری ہے۔ جانوں کا قتل، آبروؤں کا قتل، شرافت و ناموس کا قتل، اقدار کا قتل، دین و ایمان کا قتل ـــــ قتل، قتل، قتل! ـــــ قاتل قتل کر رہے ہیں اور اُنہیں پُورا تحفظ حاصل ہے اور کشتگانِ ستم اور زخم رسیدگانِ جبر خاموش ہیں۔

اس خاموشی پر ایک افسانے کا انجام میرے ذہن میں قیامتیں برپا کر رہا ہے۔ افسانہ مہمان نوازی میں جب نذیراں نواب کے زنان خانے میں پہنچادی جاتی ہے تو اگلی صبح کا منظر ملاحظہ فرمایئے:

بشیرا مہمان خانے سے نواب صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔ نواب صاحب برآمدے میں ایک کُرسی پر بیٹھے سُنہری دُھوپ سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔

میری بیوی کہاں ہے جناب؟

نواب صاحب نے بڑے سکُون سے ہاتھ سے ایک چھوٹے سے کمرے طرف اشارہ کر دیا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ بشیرے نے کمرے میں نذیراں کو غافل سوتے ہُوئے پایا وُہ بے تابی سے پُکارا

نذیراں نے مُشکل سے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے بولی۔

"چلو بشیرے یہاں سے، جلدی چلو"

اس سے آگے وہ کچُھ نہ کہہ سکی اور نہ بشیرے کو کچُھ پُوچھنے کی جُرأت ہو سکی۔ بشیرے نے نذیراں کا ہاتھ تھاما اور نواب صاحب کو سلام کئے بغیر ایک رات کے یہ مہمان بنگلے سے رخصت ہوُئے ـــــ

"سلام کئے بغیر" کا ٹکڑا ایک مجبُور اور مظلُوم شخص کی طرف سے ایک خاموش احتجاج بھی ہے اور اُس عذاب کی وعید بھی جو کبھی عاد و ثمود کی بستیوں پر نازل ہُوا تھا اور خُدا ایسا عذاب دوبارہ بھیجنے پر پُوری طرح قادر ہے!

حسن رضا کے خاکے اور افسانے

—— پروفیسر فرخ دُرّانی

اِختصار، جامعیت، افسانویت، بے جا تفاصیل اور اسراف الفاظ سے گریز، صحت مند مقصدیّت، معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی نقطۂ نظر، حقیقت بینی و حقیقت پسندی، ناروا ابہام، پیچیدگی، اشاریت، علامتیت سے انحراف، شدّت تاثیر، اعلیٰ کردار نگاری، پلاٹ کی فنکارانہ ساخت، انجام تک تحیّر اور تذبذب کی موجُودگی جناب حسن رضا گردیزی کے فن افسانہ نگاری کی نمایاں خصُوصیات ہیں۔

عام زندگی افسانے سے مختلف ہوتی ہے۔ افسانہ جہاں زندگی کے کسی خاص لمحے کا فنکارانہ عکاس ہوتاہے وہاں عام زندگی عام طور پر مختلف، غیر متعلق، غیر دلچسپ، سپاٹ، بے ترتیب اور غیر مربُوط حالات و واقعات کا ایک ملغوبہ ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کا کام کٹھن ہوتاہے۔ وُہ زندگی کے اس منتشر اور بے ربط ہڑبونگ سے اپنی خُداداد افسانوی بصیرت کی مدد سے اپنا مواد تلاش کرتاہے۔ یہ مواد بظاہر اہم مگر چھوٹے بڑے بے ربط اور بکھرے ہُوئے واقعات کی صُورت میں اُسے ملتاہے۔ وُہ اپنی فنّی مہارت کی بنا پر ان واقعات کے تار و پود کو یکجا کر کے اُن کو اپنی تخلیق کی بھٹی میں رکھ کر تخیّل کی آنچ دیتاہے۔ حقیقت اور عدم حقیقت کے امتزاج سے ایک فن پارہ تخلیق کرتاہے جو کُھلے جھُوٹ سے زیادہ قابل یقین اور سپاٹ حقیقت سے زیادہ

دلچسپ اور جاذبِ توجّہ ہوتا ہے۔ بقولِ عدم :

حقیقتیں تو ریا سے حسین ہوتی ہیں
مرے خلوص کو شامل نہ کر فسانے میں

حسن رضا گردیزی کو یہ فن آتا ہے۔

پلاٹ میں واقعات کی ترتیب اور یہ بات کہ افسانے کو کہاں سے اور کیسے شروع کیا جائے اور کہاں اور کیسے ختم ہو۔ افسانہ نگار کے لِئے بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ اسی واقعات کی ترتیب پر ہی قاری یا سامع کی تمام تر دلچسپی کا انحصار ہوتا ہے۔ بے شمار اچھے موضوع اور اچھے واقعات کے حامل افسانے غلط ابتدا، یا غلط انجام کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ افسانے میں ہر چھوٹے بڑے واقعے کی اپنی ایک اہمیت اور اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ اگر ایک واقعے اور ایک تفصیل کو غلط مقام پر لایا جائے۔ تو افسانے کے سارے پلاٹ پر زد پڑتی ہے اور افسانے کا مجموعی تاثر مجروح ہوتا ہے۔ واقعات کی ترتیب اور ابتدا۔ وسط اور مقام کا یہ شعور فنکار میں زیادہ تر فطری اور وہبی ہوتا ہے۔ یہ سیکھنے، سکھانے اور سمجھنے سمجھانے سے نہیں آتا۔

حسن رضا گردیزی میں یہ شعور فطری اور خداداد ہے۔ وُہ افسانے کو وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے فنّی تقاضوں کے مُطابق شروع کرنا چاہیئے۔ آغاز میں وُہ واقعات لاتے ہیں جو لانے چاہئیں اور انجام وہاں کرتے ہیں جہاں کرنا چاہیئے اس ضمن میں ان کا افسانہ "مولوی کریم اللہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

ایک اچھا افسانہ روشنی اور تاریکی کا ایک خوبصورت اور طلسماتی امتزاج ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کچھ باتیں کہتا ہے اور کچھ ان کہی چھوڑ دیتا ہے۔ افسانہ لکھنے کے دوران میں افسانہ نگار کے ذہن میں پلاٹ اور واقعات سے متعلّق ضروری اور غیر ضروری جا اور بے جا، برمحل اور بے محل جزئیات و تفصیلات کا ایک سیلاب اُمنڈنے لگتا ہے۔

ایک نومشق اور نو آموز افسانہ نگار ——— "ہر چہ آید در گھسیٹ" کے مصداق اچھی، بُری، چھوٹی بڑی، ضروری اور غیر ضروری تفصیل پر بھُوکے بھیڑیئے کی طرح جھپٹتا ہے اور اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنے افسانے میں گھسیٹ دیتا ہے

لیکن ایک اچھا افسانہ نگار ایسے موقعہ پر پریشانی اور بے صبری کا شکار نہیں ہوتا۔ وُہ ٹھنڈے دل سے اپنی قوتِ ممیزہ کو کام میں لاکر ردّ و قدح کے عمل کے ذریعے غیر ضروری، غیر دلچسپ اور بے جا تفاصیل کو قلم زد کر دیتا ہے۔ اور ضروری واقعات کو انتخاب کرکے انہیں افسانے کے تانے بانے میں شامل کر دیتا ہے۔ ایک ناکام اور سادہ لوح افسانہ نگار ساری باتیں کہہ ڈالنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ ویسے تو وُہ ایمانداری اور اخلاص کا ثبوت دیتا ہے اور اپنے قاری سے کوئی چیز چھپا کر نہیں رکھتا۔ لیکن فن کی دُنیا میں اس قسم کا خلوص فنکار کو بہت مہنگا پڑتا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ حسن رضا گردیزی کا فن اس قسم کے خلوص اور ایسی ایمانداری سے مبرّا ہے۔ ایک بڑے افسانہ نگار (اور وسیع مفہوم میں ایک فنکار) کا سب سے بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ وُہ اپنے فن پارے میں وُہ بات کہہ دیتا ہے جو اسے نہیں کہنی چاہیئے تھی اور وُہ بات نہیں کہتا جو اُسے کہنی چاہیئے تھی۔

حسن رضا گردیزی فن میں اَن کہی اور ان کہی کی اہمیت سے واقف ہیں۔ وہ وہاں بولتے ہیں جہاں ضروری ہوتا ہے اور جہاں ضروری نہیں ہوتا وُہ ایک گوتی چُپ سادھ لیتے ہیں۔ وہ گفتنی کو ناگفتنی سے الگ کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کے افسانے۔ ویربھان، راجاں اور جیب تراش ان کے اس شعور کی عمدہ مثالیں ہیں۔

حسن رضا کے افسانوں اور خاکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے زندگی کا بہت قریب سے بغور اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ وُہ ایک سرکاری افسر (تحصیلدار) رہا ہے۔ اور اب ایک صحت مند اور پُرسکون ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے اکثر افسانے اس کی اپنی زندگی کے چشم دید واقعات پر مبنی ہیں۔ یہ وہ واقعات ہیں جنہیں تھوڑی بہت تخیل کی رنگ آمیزی سے اس نے افسانوں کا رُوپ دے دیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کا تاثر بہت شدید ہو گیا ہے مصنف ایک جہاندیدہ شخص ہے اور اُس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اور قسم قسم کے لوگ دیکھے ہیں۔ لیکن وہ شیخ سعدی کے جہاندیدہ شخص کی طرح (جہاندیدہ بسیار گوید دروغ) سراسر دروغ بافی اور مبالغہ آرائی نہیں کرتا۔ اس حقیقت پسندی کی وجہ سے اس کے افسانوں میں زندگی کا ضمیر دھڑکتا نظر آتا ہے۔ اور ان سے زندگی کی آنچ آتی

ہے پچھلے تیس پینتیس سال میں ۱۹۵۰ء سے تاحال اُردو افسانے نے جو موضوع اور اُسلوب کی کئی کروٹیں بدلی ہیں اور مختلف انواع و اقسام کے افسانے سامنے آئے ہیں لیکن حسن رضا گردیزی نے "یک در گیر محکم گیر" کے مصداق اپنے کلاسیکی انداز ہی کو قائم رکھا اور نت نئے اسالیب کو دیکھ کر کسی قسم کے احساس کمتری اور پریشان خیالی کا شکار اپنے آپ کو نہیں ہونے دیا۔ اُنھوں نے وہی انداز اپنایا ہے جو موپسان کا ہے منٹو کا انداز ہے جو دُنیا کے ہر اچھے افسانہ نگار کا انداز ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

حسن رضا گردیزی کے فن کو سمجھنے کے لئے ان کے افسانوں کا تجزیہ ضروری ہے۔ افسانہ 'مہمان نوازی' میں مصنّف نے بتایا ہے کہ بعض میزبان اپنے مہمانوں سے کس طرح سلوک کرتے ہیں۔ اس میں اغوا کے موضوع کو بھی لیا گیا ہے۔ بشیرا نذیراں کو کس طرح اغوا کر کے ایک شہر لے جاتا ہے۔ اور نوکری کے لالچ میں کس طرح ایک نواب صاحب کے ہاں ٹھہرتا ہے۔ اور وہاں نذیراں سے کیا بہیمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ اغوا پر ایک چوٹ ہے اور مغویاؤں کے ساتھ اغوا کے بعد جو سلوک اجنبی ماحول اور نامساعد حالات میں ہوتا ہے اس کی قلعی کھولی گئی ہے۔ 'پیر سائیں' ایک چشم دید سچا واقعہ ہے۔ اس میں ان نام نہاد پیروں کا بھانڈا پھوڑا گیا ہے جو تصوّف اور رُوحانیت کے پردے میں لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک پیر صاحب ایک شادی کی محفل رقص و سرود میں رقص کر کے بستی کے تمام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور صبح ہونے پر معلوم ہوتا ہے کہ بستی کی ساری بھینسیں چوری ہو گئی ہیں۔

'مصیبت زدہ لڑکی' ان نام نہاد مصیبت زدہ لڑکیوں پر ایک بھرپور طنز ہے جو اپنی من گھڑت مصیبتوں کی داستانیں سناتے اور ہوٹلوں، سینماؤں، بازاروں اور چوراہوں پر مذہبی اور ادبی کتابیں بیچنے کے دَرپردہ اپنے جذبۂ عصمت فروشی اور شہرت پرستی کی تسکین کرتی ہیں۔

'مولوی کریم اللہ' قدیم وضع کے ایسے مولویوں اور اسکولوں کے اُستادوں پر ایک پُر مزاح طنز ہے جو امراء کی خوشامد کرنا، غرباء سے نفرت کرنا۔ اخلاقی اور رُوحانی اقدار کا کھوکھلا پرچار کرنا اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے پیسہ اکٹھا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

'دیربھان' جیلوں میں افسروں کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں، بدعنوانیوں اور بے قاعدگیوں کا ایک عبرت ناک انکشاف ہے۔ افسانے کا پلاٹ بڑی فنی مہارت اور چابک دستی سے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح جیل کے حکام ایک بے قصور آدمی کو پھانسی دیتے ہیں اور پھر کس طرح اپنے جرم کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

'سردارا چپراسی' سرکاری اور دفتری چپراسیوں کی ناجائز ذرائع سے آمدنیوں اور ان کی عجیب و غریب بسر اوقات کی کہانی ہے۔

'جیب تراش' فن جیب تراشی کے اسرار و رموز پر ایک خوبصورت اور دلچسپ افسانہ ہے۔

'حافظ جھکاوالدین' کوئی افسانہ نہیں بلکہ ایک افسانوی قسم کے مفلس اور قلاش آدمی کا ایک شخصی خاکہ ہے۔ حافظ جھکاوالدین۔ کوئی ایک آدمی نہیں بلکہ ایسے بے شمار لوگ ہمارے معاشرے میں حالات کی نامساعدت کی وجہ سے مفلسی۔ بے سروسامانی اور جرم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

'راجاں' گاؤں کے بڑے زمینداروں کے ظلم و تشدّد اور مظلوموں کی بربادی کی ایک المناک داستان ہے۔

'بگو میراثی' حسن رضا گردیزی کے اور بہت سے افسانوں کی طرح واقعے اور صورتِ حال کا افسانہ ہے۔ اس افسانے سے میراثیوں کی اندرونی زندگی اور ان کی جنسی آلودگیوں میں جھانکنے کا موقعہ ملتا ہے۔

'دوستی' اس افسانے میں امیر اور غریب کی دوستی کا المناک انجام دکھایا گیا ہے۔ اس قسم کی دوستی میں انجام کار نقصان غریب کو ہی ہوتا ہے اور امیر لوگ عام طور پر۔ "گاہے بسلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بدہند" کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ غریب سلابت خاں اپنے امیر دوست جہانگیر خاں کے لئے ساری عمر قربانیاں دینے کے باوجود آخری عمر میں دلتے کی طرح ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ افسانے کا انداز سیدھا سادہ اور بیانیہ ہے۔

'شیخ نصیرالدین کی قل خوانی' ماحول، سلیقہ شعاری' شاپنگ، راجاں، نرس" اور کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اندر اس مسئلے کے" اور ماہلا ماچھی بھی بڑے دلچسپ اور کامیاب افسانے ہیں۔

حسن رضا گردیزی نے تھوڑا ہی عرصہ ہوا افسانے لکھنا شروع کئے ہیں اور طبعی مناسبت

اور مسلسل مشق کی وجہ سے اُنہوں نے اس قلیل مدت میں اچھے افسانے تخلیق کر لیے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد ہی فن اور افسانے کی دُنیا میں قدم رکھا ہے۔ انگریزی زبان کے مشہور ناول نگار BURNS نے ساٹھ سال کی عمر میں اپنی ناول نگاری کا آغاز کیا تھا اور جب وُہ پچاسی سال کی عُمر میں مرا تو دُنیا کے بہت بڑے پائے کے ناول نگاروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

حسن رضا گردیزی کے افسانوں کی ایک اور خُوبی جو اُنہیں اپنی قبیل کے دوسرے مقصدی اور معاشرتی افسانہ نگاری سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے وُہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں کہیں بھی ناصحانہ۔ خطیبانہ اور واعظانہ انداز نہیں ملتا۔ وہ افسانہ نگار جو افسانوں میں مقالے لکھتے ہیں اور خُود براہِ راست اپنے کرداروں کی زبانی اخلاقیات اور نظریات کا پرچار کرتے ہیں خُود ہی بعض واقعات پر افسانے کے دوران ساتھ ساتھ تنقید کرتے جاتے ہیں۔ اچھے واعظ تو ہو سکتے ہیں۔ اچھے افسانہ نگار نہیں اب وُہ وقت گُزر گیا ہے جب کہانی یا افسانے کے اختتام پر دیندار قسم کا مصنّف لکھ دیا کرتا تھا۔ "سچ ہے لالچ بُری بلا ہے"۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وُہ افسانے میں بغیر کسی قسم کی نظریاتی بحث گھسیڑے واقعات اس طرح سے پیش کرے کہ قاری کے ذہن میں خُود بخود اس کے نظریات کی تصدیق ہو جائے۔ افسانہ نگار کو اپنی طرف سے اپنے نظریات کا برملا براہ راست یا بالواسطہ اظہار کرنے سے گریز کرنا چاہیئے اور صرف واقعات بیان کر کے نتائج قاری پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ اگر وہ کامیاب افسانہ نگار ہے تو قاری کے شعُور پر خُود بخود اس کے نتائج اور نظریات مرتب ہو جائیں گے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وُہ یقیناً ایک نا اہل اور ناکام افسانہ نگار ہے۔ افسانے میں اپنے نظریات کا پرچار کرنے والا افسانہ نگار دراصل لاشعُوری طور پر اپنے عجز اور فنّی نا اہلی کا اعتراف کرتا ہے۔ یعنی جب اسے دورانِ تخلیق افسانہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ممکن ہے افسانے کے واقعات اس کے نظریات کا ٹھیک اور مناسب ابلاغ قاری تک نہ کر سکیں تو پھر وُہ لاشعُوری طور پر کھُلم کھُلا لیکچر بازی پر اُتر آتا ہے۔ خُوشی کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی لیکچر بازی ہمیں حسن رضا گردیزی کے افسانوں میں کہیں نظر نہیں آتی۔

حسن رضا گردیزی کے افسانوں کی زبان سلیس، سادہ، عام فہم اور رواں ہے۔ وہ مشکل الفاظ استعمال نہیں کرتے مُشکل سے مُشکل صُورتِ حال کو بغیر ثقیل، نامانوس اور بھاری بھرکم الفاظ

کا سہارا لیتے سادہ سے سادہ الفاظ میں ادا کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ٹھنڈے دل سے افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں سے ان کے نظریات اور ان کی پسند و ناپسند کا پتہ تو ضرور چلتا ہے لیکن کہیں جھلّاہٹ، جذباتیت، انتہا پسندی، تنگ نظری، جانبداری اور تعصّب کا احساس نہیں ہوتا۔ وُہ مسکرانے کا فن جانتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔ کسی چیز سے نفرت نہیں کرتے۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر چیزوں کو ان کے وسیع آفاقی تناظر میں دیکھا جاتے تو کسی چیز سے نفرت نہیں کی جا سکتی۔ قضا و قدر اور ایسے حالات کی دُنیا میں جن پر ہمارا کوئی قابو نہیں ہم سب مجبُور ہیں ہمارے ارادے کو ہمارے اعمال میں بہت کم دخل ہے۔ بلکہ ہمارا ارادہ بھی بعض ایسے حالات کے تابع ہے جن پر ہمارا کوئی بس نہیں چلتا۔ ہمارے تمام اعمال، تمام ارادے اور تمام اختیار، ہماری جبلت، ہماری فطرت، ہمارے ماضی اور ہمارے ماحول کے ہاتھوں مجبُور ہیں۔ جب آدمی شعُور کے اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ اچھی چیز کو اچھا اور بُری کو بُرا سمجھتا تو ہے لیکن وہ کسی چیز سے نفرت نہیں کرتا۔ یہ وُہ مقام ہے جس کے بارے میں کسی شاعر (شاید غالب نے کہا ہے)

رازدانِ خوئے دیرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں می زنم

اُردو افسانے کو حسن رضا گردیزی سے بڑی توقعات ہیں اور ان میں ابھی ہمیں ارتقا کے بے شمار امکانات نظر آتے ہیں۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

حسن رضا گردیزی — ایک افسانوی شخصیت

ڈاکٹر انوار احمد
شعبۂ اردو زکریا یونیورسٹی۔ ملتان

ملتان انتہائی خوش نصیب اور بے حد بدنصیب خطّہ ہے۔ یہ سرزمین بے حد زرخیز اور بہت چٹیل ہے۔ یہ علاقہ بے پناہ روشن خیال، علم دوست اور ادب پرور لوگوں کا ہے اور انتہائی درجے کے تنگ نظر، علم دشمن اور ادب سے متنفّر افراد بھی یہاں بستے ہیں۔ انسانوں سے محبّت کرنے والے درویشوں کے یہاں مزار ہیں اور انسانوں کو شرفِ آدمیت سے محروم کرنے والے مجاور بھی یہاں ہیں۔ یہاں علم وفن کے خزانے ہیں اور ان پر بیٹھے ہوئے سانپ بھی۔ یہاں غلامی، تنگ نظری اور استحصال سے نفرت کرنے والے اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے والے سیاسی کارکن بھی ہیں اور ہر دور میں ان کی قربانیوں کو فروخت کرنے والے اور تشدّد کے کوڑوں سے ادھڑی ہوئی کھالوں کی تجارت کرنے والے سیاسی رہنما بھی۔ یہاں کشادہ دل، خندہ جبیں اور عالی ظرف بھی ہیں اور تنگ دل، تنگ نظر اور کم ظرف بھی۔ یہاں محترم و معزز خانوادوں کی نحوست بھی ہے اور انہی خاندانوں کے ایسے چشم وچراغ بھی ہیں جو اپنی روح، ضمیر اور شعور کو حویلیوں میں دفن ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ وہ قلعۂ معلّیٰ کے ادبی، تہذیبی اور جمالیاتی ذوق سے بہرہ ور ہو کر بھی عام آدمی کے ادبی و جمالیاتی ذوق اور تخیل کے لیے فیض رساں ثابت ہوتے ہیں۔

سید حسن رضا گردیزی ایسے ہی ایک چشم وچراغ ہیں جو ضعیف الاعتقادی، توہمات اور

جہالت کے اندھیرے کو مُسلط رکھنے پر مُصر نہیں۔ وہ اس خطے کی تہذیب و ثقافت کی حنوط شدہ نشانی نہیں بلکہ زندگی کے تغیرات اور تموجات کے طفیل اُبھرنے والی نئی صداقتوں کو خُوش دلی سے قبُول کرنے اور نفاست طبع کی وضعداری کے باوجُود جوانی کی مُنہ زوری کے لیے تحسین کے والہانہ جذبات رکھتے ہیں۔ وہ تحرک پسندی کے باعث رقص تن اور اُس سے بڑھ کر رقص جاں کے قائل ہیں۔ موسیقی اور فنُون لطیفہ سے بے پناہ رغبت، مشرق و مغرب کے علم و ادب کے دوامی اجزائے لطیف کا احترام، رندی و سرمستی کے علمبردار، نا مختتم ذخیرۂ الفاظ، انسان دوستی، کُشادہ دلی اور حسنِ کلام کے ساتھ ساتھ کلام کے تمام درجات و امکانات سے شناسائی اور ہر چیز سے بڑھ کر بے حد زرخیز اور ہمہ وقت متحرک حسِ مزاح کو یکجا کر دیں تو حسن رضا کی وُہ شخصیت تشکیل پاتی ہے جو ایک افسانوی شخصیت بلکہ کلچرل ہیرو کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ یہ وُہ کلچرل ہیرو نہیں جس کے مثالی قبائلی اوصاف شجاعت، شہسواری، شمشیر زنی، سخاوت اور استقامت کا چرچا ہو۔ البتہ خانہ بدوش مردانگی جس طرح کی کمند اندازی، ناوک افگنی اور جود و سخا کا تقاضا کرتی ہے۔ سود سوزی اور زیاں فراموشی کے ساتھ ساتھ جس والہانہ سُپردگی کی طلب گار ہے۔ نیم افسانوی اور نیم تاریخی حکایتوں کے مُطابق ان سب سے سید حسن رضا گردیزی کی ذات مالا مال ہے۔ کوئی افسانوی شخصیت افسانہ بننے کے لئے تو پیدا ہوتی ہی ہے۔ مگر افسانہ لکھنے پر بھی قادر ہے؟ یہ اپنی جگہ ایک دلچسپ سوال ہے اور اس کا جواب شاید میں بخُوبی دے سکتا تھا۔ اگر مجھے حسن رضا گردیزی کی افسانوی اور ثقافتی شخصیت سے پیار نہ ہوتا لیکن ایک بات طے ہے کہ حسن رضا گردیزی روایتی قصہ گو کے سبھی اوصاف رکھتے ہیں۔ وُہ ہماری بستی کے دانا و بینا شخص ہیں۔ شب بیدار ہیں۔ نگر نگر میں گھُومے ہُوں گے تو کوئی کوچہ ایسا بھی نہیں جہاں وہ نہ گئے ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وُہ ہر طرح کی بات کئی طرح سے کہنے کا ڈھنگ رکھتے ہیں۔

سید حسن رضا گردیزی کی افسانوی شخصیت کے گرد جو ہالہ ہے وہ مجبُوری اور محرومی کے مارے ہوؤں کی حسرتوں نے قائم کیا ہے۔ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہار کو ترسنے والوں کے لئے سید حسن رضا گردیزی کے تخلیقی جملے نہ صرف جذباتی اور فکری آسرا بنتے ہیں۔ بلکہ وہ لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کی طرح ان تخلیقی جملوں کو سنوارتے اور نکھارتے بھی رہتے ہیں۔ اور موقع کی مناسبت سے حسن رضا گردیزی کے انہی اقوالِ زریں اور ان سے وابستہ حکایات کی تخلیق تو کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح میرے

نزدیک ان کی اپنی شخصیت ایسی ہے کہ اس پر ناول، افسانہ اور ڈرامہ لکھا جائے۔ یا پھر شاہ صاحب ذرا ہمت سے کام لیکر اپنی آپ بیتی لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی ایسی تصنیف ادب و تہذیب اور احساس و فکر کا شاہکار ہو گی۔ آپ کے زیرِ نظر جو افسانے ہیں ان کی بنیادی اہمیت تو یہی ہے کہ اُنہیں سید حسن رضا گردیزی نے تخلیق کیا ہے۔ یہ افسانے خاصے پرانے یا قدامت آثار ہیں۔ اس لئے انہیں نئے افسانے کے فنّی تقاضوں پر پرکھنے کی کوشش غیر ہمدردانہ ہو گی۔ جس زبان کے افسانے نے منٹو۔ غلام عباس اور راجندر سنگھ بیدی کا تخلیقی لمس محسوس کیا ہے۔ اس میں چٹکلے یا عبرتناک واعظ آسانی سے گھل مل نہیں سکتے تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان افسانوں میں ایک باشعور حساس۔ درد مند انسان دوست اور لبرل شخص جلوہ دکھاتا ہے۔ اگرچہ شاہ صاحب کی گفتگو کے جس اُسلوب کو ہم نے ہوش سنبھالنے پر دیکھا اور اس سے لُطف لیا ہے۔ وُہ ان افسانوں میں جزوی طور پر ہی ظاہر ہُوا ہے۔ وہ جب بھی گفتگو کرتے ہیں محسُوس ہوتا ہے۔ کہ اُنہیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مگر وُہ اپنے چہرے پر ایک معصُوم سی مُسکراہٹ سجا لیتے ہیں۔ اور پھر جب وہ فکر کی برق پاشی کرتے ہیں اور اپنی بے حد قوی حس مزاح اور ختم نہ ہونے والے ذخیرۂ الفاظ سے باغ و بہار کا دلفریب سماں پیدا کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں مجھے تو صرف نجم الدین جفار میں شاہ صاحب کے مخصُوص اور منفرد اُسلُوب کی جھلک دکھائی دی ہے۔

"ہر روز اور تقریباً ہر وقت کی شانہ کشی نے اس باوقار ریش کے دونوں حصّوں کو کھُلی ہُوئی مقراض کے پروں کی طرح ایک دُوسرے سے الگ کر رکھا تھا۔"

"صُوفی صاحب کے حسن ابلاغ کی ہم آہنگی کے ساتھ ان کی ڈاڑھی کے دونوں پھل مربُوط انداز میں حرکت کر رہے تھے جیسے طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہو۔"

"صوفی صاحب ایک چارپائی کے پائے کے ساتھ بندھے ہُوئے مسند خاک پر جلوہ افروز تھے آپ کا ملبوس جہلاکی چیرہ دستیوں کی وجہ سے دریدہ ہو چکا تھا۔ ان کے بال ماتھے کے زخم کے خوں سے تر تھے۔ عینک کا تو ذکر ہی کیا دونوں آنکھوں کے نیچے کے نیلگوں حلقے دکھائی

دے رہے تھے۔"

کاش اس مجموعہ کا تمام تر کمال ہی اُسلوب ہوتا۔ بہر طور کچھ اور افسانوں میں بھی وہی شاہ صاحب دکھائی دیتے ہیں جو ہم سب کو عزیز ہیں۔ دیکھیے۔

"قصائی کوئی ذات نہیں ہے یہ تو پیشہ ہے ورنہ آج دُنیا میں ہر شخص قصائی ہے۔"

مُلاحظہ فرمائیے!

"آخر کار الیکشن کا دن آیا۔ شریفوں اور خاندانی آدمیوں نے نواب صاحب کی پوری حمایت کی متعلقہ افسروں نے بھی انتہائی دیانتداری سے اپنے فرائض کی انجام دہی کی۔ نواب صاحب الیکشن جیت گئے۔ پاکستان زندہ باد، صدر ایوّب زندہ باد، نواب صاحب زندہ باد، باقی سب مُردہ باد"

سیّد حسن رضا گردیزی کی طبیعت میں انکسار بھی حد درجہ ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی ہجویات یا ان سے منسوب ہجویات کا نشانہ بننے والے اس سے اتفاق نہ کریں۔ جناب فرخ دُرّانی نے انہیں بعض افسانوں کے عنوان تبدیل کرنے کا مشورہ دیا اور جناب گردیزی نے فی الفور ایسے ہی کر دیا۔ حالانکہ میرے خیال میں ان کے افسانوں کے اولین عنوانات بہتر تھے۔

حسن رضا گردیزی۔ ان کی کہانیاں اور خاکے

—— ڈاکٹر اے۔ بی اشرف

جناب حسن رضا گردیزی ملتانی تہذیب و ثقافت کا چلتا پھرتا حوالہ ہیں۔ ادب شخصیت کا پَرتَو ہوتا ہے اس لیئے وہی تہذیبی اور ثقافتی حوالے ان کی تخلیقات میں بھی موجود ہیں۔ جو ان کی ذات کا حصہ ہیں۔ یعنی خلوص۔ بے ریائی۔ انصاف پسندی۔ بے باکی اور مظلومیت کا درد۔

حسن رضا گردیزی جس پیشے سے وابستہ رہے ہیں اور وُہ جس خانوادے سے متعلق ہیں دونوں میں ٹھکرائے ہُوئے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے اس لیئے حسن رضا کی کہانیوں میں ان لوگوں کی نفسیات اور مسائل کا پرتو ملتا ہے۔ اِن کہانیوں میں بے رحم حقیقت نگاری کی تلخی بھی ہے اور ایک شاعر کا مظلوم مخلوق کے بارے میں جذبۂ انصاف بھی۔

حسن رضا گردیزی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ اور بڑے حساس۔ اس لیئے عصری حیثیت کے حوالے ان کی کہانیوں میں تواتر کے ساتھ آتے ہیں۔ ان کہانیوں کے پلاٹ ہماری روزہ مرہ کی زندگی سے عبارت ہیں اور کردار ہمارے سامنے کے مسائل کا شکار انسان ہیں۔

حسن رضا گردیزی کا سادہ اور بے ریا اُسلوب ان کہانیوں کو مؤثر بنا دیتا ہے۔ ان کے یہاں جدید علامتی یا تجریدی انداز نہیں ہے اور نہ وُہ استعاراتی اُسلوب اِختیار کرتے ہیں کیونکہ انہیں ادب میں ابہام کا قائل نہیں کیا جا سکتا۔ وُہ زندگی میں بھی بے باک اظہاریت کے قائل ہیں۔ اور ادب میں بھی ان کا رویّہ "سٹریٹ فارورڈ" اِنسان کا ہے۔ ان کی نفرت اور محبت چھپی نہیں رہ سکتی۔ ان کی کہانیوں میں دلچسپ بیانیہ انداز ہے۔ علامتی اور مبہم اُسلوب نہیں ہے۔

مولوی کریم اللہ

خدا بخشے مولوی کریم اللہ کو۔ نہایت نیک اور پاکباز بزرگ تھے۔ وہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں چھٹی اور ساتویں جماعت کو اُردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ اور اِسی سلسلے میں مجھے ان کی شاگردی کا دو سال تک شرف حاصل رہا۔

مولوی صاحب طویل قامت، عظیم الجثہ اور شرعی ہیئت کذائی کے حامل تھے۔ ان کی قمیص کے چوتھے بٹن تک پہنچی ہوئی گھنی سیاہ اور چمکدار ڈاڑھی جسے روزانہ دھو دھا کر معطّر کر لیتے تھے۔ ان کی وجاہت اور جلال میں بے حد اضافہ کرتی تھی۔ ان کی توند جب وہ کمرے میں داخل ہوتے تو اُن کی تشریف آوری سے پانچ سیکنڈ پہلے دروازے سے جھانکتی جسے دیکھ کر طلبا، اپنی نشستوں پر کھڑے ہو جاتے اور ان کا شایانِ شان استقبال کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے فرقِ اقدس پر ململ کی نصف تھان کی دستارِ والا تبار رہتی تھی جسے وہ ہر ماہ دو چار گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد سر پر موزوں کرتے تھے۔ یہ دستار سارا مہینہ اسی حالت میں رہتی اور اس کی نوک پلک میں ذرا بھی فرق نہ آتا۔

مولوی صاحب کی مونچھیں ان کی ڈاڑھی سے بھی زیادہ گھنی اور سیاہ تھیں اور ان کی ریش مبارک میں کاملاً مدغم ہو چکی تھیں۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے اس پُر خلوص ملاپ نے

مولوی صاحب کے ذہن کو بقول میرزا غالب دیدہ عالم سے پنہاں کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کی گرجتی ہوئی آواز ان مرتعش بالوں کے جھنڈ سے جب چھن کر باہر نکلتی تو کلاس پر ایک دبدبہ طاری ہو جاتا۔ مولوی صاحب کا سفید طویل اور عریض کرتہ جو مولوی صاحب کو گھٹنوں تک اپنی آغوش میں لئے رہتا تھا کسی قبر پر چڑھے ہوئے غلاف کی طرح دیکھنے والوں کو عقیدت سے نگاہیں نیچی کر لینے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس کے نیچے ٹخنگا پائے جامہ جو توند اور کرتے کے نیچے ناپید ہو جاتا تھا۔ صرف تنگ پائنچوں کی وجہ سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ جس طرح مور کے پنجے اس کی ساری خوبصورتی کو ضائع کر دیتے ہیں اسی طرح مولوی صاحب کا بہاول پوری ساخت کا مضبوط جوتا مستقل بار برداری اور برسوں تک کچی اور پکی سڑکوں کی مٹی چھان کر سخت بدزیب ہو گیا تھا۔ چونکہ مولوی صاحب کی نگاہ اپنی توند کی وجہ سے پاؤں پر نہیں پڑ سکتی تھی اس لئے وہ اس سے غافل رہتے تھے ورنہ وہ اسے ضرور تبدیل کرتے۔ مولوی صاحب کے چہرے پر دو شربتی نیم واغزالان ختن کی سی آنکھیں سرمے کے فیض سے ہمیشہ تر و تازہ رہتی تھیں۔ مولوی صاحب کے کرتے کے اندر ایک کھدر کی واسکٹ تھی جس سے بیک وقت ایک بنیان اور دو تھیلوں کا کام لیا جاتا تھا۔ یہ تھیلے اس واسکٹ کی دو جیبیں تھیں۔ جن میں مولوی صاحب اپنی ضرورت کی اشیاء نسوار کی ڈبیہ۔ ضروری کاغذات اور نقدی ڈالتے اور نکالتے رہتے تھے۔

مولوی صاحب نسوار کے رسیا تھے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ اپنا دایاں ہاتھ واسکٹ کی بائیں جیب میں ڈالتے ڈبیہ نکالتے پہلے اسے انگلیوں سے ٹھونکتے پھر اس کا ڈھکنا اٹھا کر چٹکی بھر نسوار مونچھوں کے بالائی حصہ پر رکھ دیتے جسے ان کے خودکار نتھنے فوراً اسٹرک لیتے تھے۔ نسوار بازی کا یہ سلسلہ غیر شعوری طور پر سارا دن جاری رہتا تھا۔ جو مولوی صاحب کے لباس کی قدامت سے زیادہ ان کی فطرت پر غالب تھی۔ جس کا اظہار ان کی طرف سے برملا ہوتا رہتا تھا۔ ان کے نزدیک تعلیم کے لئے موزوں صرف خاندانی

لوگ ہی تھے۔ وہ عوام الناس کی تعلیم کو شرفا گردی کا سبب سمجھتے تھے۔ اسی اصول کے تحت وُہ نواب زادوں۔ مخدوم زادوں اور امیر زادوں کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے۔ دیگر طلباء جو غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی صاحب کو ایک آنکھ نہ بھاتے۔ وہ اُنہیں تعلیم حاصل کرنے کی بجائے مزدُوری کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ سند کے طور پہ وُہ فارسی کا یہ شعر سُنایا کرتے تھے۔

بد گہر را علم و فن آموختن
دادنِ تیغے بدستِ راہ زن

اِسی خصوصی توجہ کی بنا پر امیر زادے مولوی صاحب کے آگے پیچھے رہتے تھے۔ اور ان کی ہر قسم کی خدمت گزاری میں فخر محسوس کرتے تھے۔

اسکول کے فارغ اوقات میں مولوی صاحب اسکول کی کینٹین میں جلوہ افروز نظر آتے تھے۔ جہاں ذی ثروت گھروں کے لڑکے ان کی پلاؤ اور شامی کبابوں سے تواضع کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کسی کا احسان اپنے سر نہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچّوں کو امتحان سے پہلے پرچوں سے آگاہ فرما دیتے تھے۔ ایسے شفیق اور درد مند اُستاد کے زیر سایہ پڑھنے والے طلبا مولوی صاحب کو عمر بھر یاد رکھتے تھے۔

وقت گزرتے پتہ نہیں چلتا۔ اسکول کے بعد کالج کی تعلیم سے بھی فارغ ہو کر میں نے سرکاری مُلازمت اختیار کر لی اور اسی سلسلے میں مختلف مقامات میں پھرتا رہا۔ مولوی صاحب زینتِ طاقِ نسیاں ہو گئے۔ میرے خیال میں بھی نہیں تھا کہ بیس برس بعد اس معصوم صورت بزرگ سے پھر مُلاقات ہو گی۔

تقسیم برِّصغیر کے دنوں میں جو بھیانک واقعات میری آنکھوں نے دیکھے ان کے تصور سے آج بھی میری رُوح لرز جاتی ہے۔ لُٹے پٹے بے سہارا مہاجرین کے قافلے ریل گاڑیوں سے آرہے تھے۔ زخمی مرد اور عورتیں۔ قریب المرگ بوڑھے جن کی بجھتی ہوئی نگاہیں کچھ

اور دُکھ دیکھنے کے لِئے آنکھوں میں اٹکی ہوئی تھیں۔ لُٹے ہوئے سہاگ۔ ایڑیاں رگڑتی ہوئی لاشیں۔ سہمے ہوئے بچے۔ ان سب کا میں لیہ کے مہاجر کیمپ میں بطورِ نگران استقبال کرتا تھا۔ یہ لوگ عارضی طور پر کیمپ میں مہمان ہوتے۔ ان میں چند ایک مر بھی جاتے۔ ان کو دفن کر دیا جاتا۔ باقی شہر میں غیر مسلموں کے خالی مکانات میں بسائے جاتے۔ ان کی جگہ اور آجاتے۔ انسان کی زندگی کے ایسے رُوح فرسا مناظر کو دیکھ کر ہر انسان دوست آدمی کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ مَیں سردیوں میں صُبح نو بجے کیمپ میں آتا اور رات کے بارہ بجے گھر لَوٹتا تھا۔

ایک دن میرے چپراسی نے مولوی کریم اللہ صاحب کی تشریف آوری کی اطلاع دی۔ مَیں بہت خُوش ہُوا اور مولوی صاحب کو اندر بلا لیا۔ مولوی صاحب آتے ہی مجھ سے بغلگیر ہوتے اور میرے ماتھے کو چُومنے کے بعد سامنے والی کُرسی پر براجمان ہو گئے۔ اور انتہائی مسرّت سے ہانپتے ہوئے استفسار کیا۔

'تم یہاں کب سے آئے ہو'۔

'کوئی تین مہینے ہوئے ہیں'

'تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی ؟'

'مولوی صاحب، مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کی رہائش اسی شہر میں ہے'

'دیکھو بیٹے۔ ان غریب مہاجروں کی خِدمت کو اپنا ایمان سمجھو۔ جتنا ثواب حاصل کر سکتے ہو کر لو۔ اِن کے آرام کے لِئے دِن رات محنت کرو۔ اِن کے لِئے سب کُچھ قُربان کر دو۔ اِن کے کام آؤ۔ اللہ اِس کی جزا دے گا'۔

مَیں مولوی صاحب کے ارشادات سے بہت متاثر ہُوا۔ قدرے توقف کے بعد مَیں نے پُوچھا۔

'مولوی صاحب یہاں کیا شغل ہے ؟'

"یہ میرا آبائی شہر ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد میں یہاں شرفا کے بچوں کو اُن کے گھر جا کر پڑھایا کرتا تھا۔ اب پیرانہ سالی نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ وُہ سلسلہ بھی بند ہوگیا ہے۔ معمُولی سی پنشن پر گزُارہ ہے۔ اللہ کا شُکر ہے۔"

مولوی صاحب کے ڈیل ڈول میں ذرّہ بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ صرف ڈاڑھی سپید براق ہو چُکی تھی لیکن اِس میں چمک دمک اور تازگی ویسی تھی صرف ناک کے نیچے مُونچھوں کے بال نسوار کی آمد و رفت کی وجہ سے سُنہری رنگ اختیار کر گئے تھے۔ مولوی صاحب نے شام کا ماحضر میرے ساتھ کیمپ میں تناول فرمایا اور کافی دیر تک میرے ساتھ رہے اور رُشد و ہدایت سے سرفراز فرماتے رہے۔ تقریباً ایک ہفتہ گزُر جانے کے بعد مولوی صاحب پھر تشریف لے آئے۔ مجُھ سے بغلگیر ہُوئے اور فرمانے لگے۔

"میری بیوی کہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں چار لڑکیاں دی ہیں۔ اگر ایک لڑکا بھی ہوتا تو کیسی اچھی بات تھی۔" مَیں نے اُس سے کہا۔ اللہ کی بندی کسی کا ایک لڑکا، کسی کے دو۔ میرے تو ہزاروں لڑکے ہیں۔ وہ بچے جنہیں مَیں نے پڑھایا ہے۔ وہ میرے ہی لڑکے ہیں۔ جو بیمار ہیں اللہ اُن کو شفائے کاملہ بخشے۔ جو مقروض ہیں اللہ ان کے قرض ادا کرائے۔ جو نیک ہیں اللہ اُنہیں حج کی سعادت بخشے۔ جو بَد ہیں اللہ اُنہیں نیکی کا راستہ دکھلائے۔"

مَیں نے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی لیکن اُنہوں نے مجھے اشارے سے چُپ کرا دیا اور دُعا کا سلسلہ اِسی طرح جاری رہا۔

"جو انصاف کی کرُسیوں پر جلوہ افروز ہیں اُنہیں ہائیکورٹ کا جج بنائے۔ جو جیل میں ہیں۔ اللہ اُنہیں رہائی دلائے۔ جو اولاد کے متمنی ہیں اُنہیں اولاد بخشے جو کتخدائی کے طالب ہیں اللہ اُن کی مُرادیں بر لائے۔"

مولوی صاحب نے دُعا ختم کر کے اپنے دونوں ہاتھ مُنہ پر پھیرے۔ اور پھر اپنے مطلب کی بات کی۔

"برخوردار مجھے شلواروں کے لئے لٹھے کی بڑی ضرورت ہے"۔

"اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں؟ اگر کچھ مالی امداد مقصود ہو تو حتی المقدور پیش کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

"نہیں۔ تم کیا مالی امداد کرو گے میری۔ لیکن اگر تم چاہو۔ تو میری دستگیری کر سکتے ہو"۔

'فرمائیے۔ میں حاضر ہوں'۔

"آپ مجھے کپڑا بھی حسب ضرورت دے سکتے ہیں اور آپ پر کوئی بوجھ بھی نہیں پڑے گا"۔

میں حیران تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"مولوی صاحب میں آپ کو کپڑا کس طرح دلا سکتا ہوں۔ حیرت ہے"۔

"میرا خیال تمہارے متعلق صحیح رہا۔ تم طالب علمی کے زمانے میں بھی چنداں ذہین نہیں تھے اور اب بھی تمہارا وہی عالم ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے"۔

میری حیرت میں اور بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے پاس کپڑے کی کوئی دکان نہیں تھی اور نہ میں کسی مل میں ملازم تھا۔ میں مولوی صاحب کو لٹھا مفت کیسے دلا سکتا تھا۔ آخر کافی دیر کے بعد مولوی صاحب نے اپنا مافی الضمیر اس طرح ظاہر فرمایا۔

"میاں تمہارے پاس جو مہاجر یہاں کیمپ میں فوت ہو جاتا ہے۔ اس کے کفن کے لئے کپڑے کا پرمٹ تم ڈپو والوں کو لکھ بھیجتے ہو۔ اس کپڑے کی قیمت ماہانہ کیمپ سے ادا ہوتی ہے"۔

"جی ہاں"۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ 'پھر کیا کروں'۔؟

"اگر دو چار فرضی مُردوں کے کفن مجھے دلا دو۔ کون پوچھتا ہے تم سے۔"؟

میں دم بخود ہو کے رہ گیا۔

"مولوی صاحب کیا فرما رہے ہیں آپ۔"؟

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

"آپ غریب مہاجروں کے کفن کا کپڑا بھی لے جانا چاہتے ہیں۔" میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ مولوی صاحب صورتِ حال دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور چلتے ہوئے فرمانے لگے۔

"میاں! غریب لوگوں کی امداد بھی ثواب ہے۔ مُردوں کو کفن پہناتے ہو۔ لیکن کوئی زندہ اپنے تن کو ڈھانپنے کے لِئے التجا کرے تو آنکھیں دکھاتے ہو۔ لاحول ولا قوۃ۔ مولوی صاحب ناراض ہو کر نو دو گیارہ ہوئے اور پھر مجھے ان کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔

شیخ نصیر الدّین کی قُل خوانی

کہتے ہیں کہ امیر گھرانے کا محرّم غریب کے گھر کی عید سے زیادہ شگفتہ ہوتا ہے۔ شیخ نصیر الدین کی قُل خوانی کی رسم بھی شہر میں یُونہی بڑی دُھوم دھام سے منائی گئی۔ بظاہر یُوں معلُوم ہوتا تھا کہ کسی بیرونی ملک کے فرمانروا کی آمد پر تزک و احتشام کی نمائش ہو رہی ہے۔ شہر کی بڑی سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی ریل پیل۔ شیخ صاحب نے گھر سے لیکر صدر سڑک تک چھڑکاؤ۔ قناتیں۔ صُوفے۔ غالیچے۔ ٹریفک کے اضافی سپاہی۔ غرض کہ شیخ نصیر الدّین کا گھر بلکہ ان کا محلہ اور چاروں طرف کی سڑکیں دُلہن کی طرح سجی ہُوئی تھیں۔

شیخ صاحب بڑے دیندار بزرگ تھے۔ فربہ جسم۔ کشادہ چہرہ۔ اور مُشت بھر داڑھی اُن کی نیک باطنی کے شاہد تھے۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج کے پابند اور شہر میں کئی مسجدوں کے بانی تھے۔ خُدا پرستی کی وجہ سے بختِ رسا کا یہ عالم تھا کہ گو اُن کی پیدائش ایک چھوٹے سے کچّے مکان میں ہُوئی تھی۔ لیکن وفات ایک طویل و عریض سہ منزلہ شیش محل میں ہُوئی جس کے لان میں بیسیوں موٹریں ٹھہر سکتی ہیں۔ شیخ صاحب کو اپنے آبائی مکان سے اِس قدر مُحبّت تھی کہ اُنہوں نے نقل مکانی بھی گوارا نہ کی۔ بلکہ اپنے ہمسایوں کے گھر خرید کر اپنے مسکن کی توسیع فرماتے رہے۔ شیخ صاحب نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ اچھی قیمت ملتی دیکھ کر وہ لوگ خُود ہی اپنے

گھر بیجتے چلے گئے۔

شیخ صاحب بہتر سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوئے لیکن مرتے دم تک ان کے دولت خانے میں رؤسائے شہر اور حکام وقت کا اِژدِحام رہا۔ افسران شیخ صاحب کی خصوصی عزت اور تکریم کرتے تھے کیونکہ شیخ صاحب ان کو آڑے وقتوں میں بلا سود قرضہ دیتے تھے اور اکثر حُسنِ خدمات کے صِلے میں واجبات مُعاف کر دیا کرتے تھے۔ افسران سے عوام کے کام نکلوانے کے سِلسلے میں شیخ صاحب کو یدِطولےٰ حاصِل تھا۔ اسی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول تھے۔ بلدیہ کے الیکشن کے موقعہ پر شیخ صاحب کی جماعت اکثریت سے کامیاب ہوتی رہی اور وہ برسوں بلدیہ کی صدارت کو عزت بخشتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ صاحب کے دولت کدے سے لیکر صدر سڑک تک پُختہ شاہراہ تعمیر ہو چکی تھی اور اس کے دونوں طرف سایہ دار درخت بڑی سُرعت کے ساتھ نشو و نما پا چکے تھے۔

شیخ صاحب کا ذریعہ آمدنی قراقلی کی کھالوں کی برآمد تھی۔ اس تجارت میں شیخ صاحب نے بے حساب رُوپیہ کمایا۔ نوزائیدہ بھیڑ کے بچّوں کی کھالیں اس قدر سُود مند ثابت ہوئیں کہ شیخ صاحب حاملہ بھیڑوں کو ذبح کر دیتے تھے اور ان کے پیٹ سے نِکلے ہوئے بچّوں کی کھالیں اُترواکر غیر ملکوں میں بیجتے رہے۔ اسی طرح تھوڑے ہی عرصہ میں لکھ پتی ہوئے اور بعد میں کروڑ پتی ہو گئے۔

شیخ صاحب نے اپنی زندگی میں چار عقد فرمائے۔ اور ان چاروں ازواج سے کافی تعداد میں اولاد ہوئی۔ یہ سب خُدا کے فضل سے اور شیخ صاحب کی دُعاؤں کے اثر سے انہی کھالوں کی تجارت کی بدولت آسُودہ اور خُوشحال ہیں۔ آج سے چند ماہ پیشتر دُشمنوں کی سازشوں سے شیخ نصیرالدین کے دو لڑکوں کو فوجی عدالت میں زرِّ مبادلہ خورد بُرد کرنے کے اِلزام میں مقدمہ چلا تھا اور اس میں انکو دس دس سال قید اور دو دو لاکھ رُوپیہ جُرمانہ کی سزا ہُوتی تھی۔

رُوپیہ آنی جانی چیز ہے۔ چار لاکھ رُوپیہ ادا کر دیا گیا۔ قید کے سلسلے میں شیخ صاحب کی دُعائیں بروئے کار آئیں اور شیخ زادے رہا کر دیئے گئے۔ چار لاکھ رُوپیہ شیخ صاحب کی ایک ہفتہ کی کمائی تھی۔ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ دولت کی اس قدر فراوانی کے باوجود شیخ صاحب گھر میں انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک مُلازم گاما اور اُس کی ایک بیوی ہاجرہ تھی جو شیخ صاحب کے باورچی خانے سے لیکر مردان خانے تک سب کاروبار کے ذمّہ دار تھے۔ شیخ صاحب کی بیگم بڑھاپے کے باوجود اپنے گھریلو انتظام اور گھر کے حساب کتاب پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ راشن کی نگہداشت ہاجرہ کرتی تھی۔ اور مردان خانے کا منتظم گاما تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی شیخ صاحب سے چار سو رُوپیہ ماہوار اور دو وقت کا کھانا لیتے تھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا لڑکا مستو چھ سال کی عُمر کا گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

قُل خوانی کے انتظام میں مردان خانے کی نشستوں کا اِنتظام شیخ صاحب کے شاہزادگان کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ اور اُن کے حُکم کے تحت کمیٹی کے مُلازمین اور کارخانے کے مزدُور بھاگ دوڑ میں مصروف تھے لیکن زنان خانے میں جہاں ایک ہزار مہمانوں کے لِئے پلاؤ اور قورمے کی دیگیں پک رہی تھیں ان پر ہاجرہ کے عِلاوہ دو اور باورچی مصروف تھے۔ اِن ہر دو کی نگرانی رکھنے کی ذمّہ داری صرف ہاجرہ کے سُپرد تھی۔ بیگم صاحبہ کو پُورا یقین تھا کہ یہ کرائے پر آئے ہوئے نانبائی گھی۔ چاول۔ گوشت اور مصالحے میں بد دیانتی کریں گے۔ اس لِئے ہاجرہ ساری رات ضرورت کی ہر چیز تول تول کر اُنہیں دیتی رہی اور ان چولہوں کے چاروں طرف گھومتی رہی۔ ایک دن پیشتر اس کا خاوند گاما ضلع کوہاٹ میں شیخ صاحب کی بھانجی کو قُل خوانی کی اِطلاع دینے کے لئے بھیج دیا گیا کیونکہ بڑے آدمیوں کی تقریبات کی اِطلاع صِرف خط و کتابت ہی تک محدُود نہیں ہوتی خصُوصی پیامی بھیجنا پڑتے ہیں۔ ہاجرہ کا اکلوتا بیٹا جو رات کو اپنی ماں سے ایک لمحہ کے لِئے بھی جُدا نہیں ہوتا تھا۔

ساری رات اپنی ماں کے ساتھ کڑاکے کی سردی میں ایک پھٹے ہوئے کرتے کے ساتھ دیگوں کا طواف کرتا رہا۔ صبح کو اسے تیز بخار کے ساتھ شدید کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ گلابی رنگ کا بلغم تھوکنے لگا۔ اتنے بڑے ہنگامے میں اس معمولی واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔
قل خوانی کی رسم ایک بہت بڑے سجے ہوئے لان میں ادا کی گئی جو چاروں طرف سے قناتوں اور شامیانوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ لان کے اندر بیش قیمت قالین بچھائے گئے۔ اندر مہمانوں کی فرشی نشست کا انتظام ہوا۔ قل خوانی میں مہمان دو دائروں میں منقسم ہو کر بیٹھے تھے۔ ایک دائرہ صاحبِ ثروت لوگوں کا تھا اور دوسرا غربا کا۔ جب کوئی مہمان کسی موٹر سے اتر کر دائرہ امارت میں داخل ہوتا تھا تو اس کی تعظیم کے لیے امیر اور غریب دونوں کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کوئی دوسری قسم کی مخلوق کا فرد اپنے متعلقہ حلقے میں وارد ہوتا تو امیر تو درکنار کوئی غریب بھی اٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ تکلفات صرف امیروں کا حصہ ہیں۔ غریبوں کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ قل خوانی کی ابتدا ایک بزرگ صورت۔ خوش پوش مولوی کی قرآن خوانی سے ہوئی۔ سامعین چپ سادھ کر مودب بن کر سنتے رہے۔ پھر فاتحہ ہوئی۔ ہاتھ سب نے اٹھائے لیکن خدا جانے کس نے فاتحہ پڑھی اور کون صرف بدبدا کر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد دوستوں اور رشتے داروں نے دستار بندی کی رسم پر ململ کے تھان اور بھاری مالیت کے نوٹ برسانا شروع کیے۔ تھوڑی ہی دیر میں شیخ صاحب کے بڑے صاحبزادے کے سامنے جس نے مرحوم کی دستارِ والا تبار باندھ رکھی تھی نقدی اور کپڑوں کا انبار لگ گیا۔ اس کارِ خیر میں چند افسروں نے بھی حصہ لیا۔ چنانچہ شیخ صاحب کی وفات اور قل خوانی پر جس قدر خرچ ہوا تھا اس سے بیس گنا وارثان کو وصول ہو گیا۔ جیسا ٹھاکر تھا ویسی ہی موت پائی۔ البتہ شیخ صاحب کے دولت کدے سے موٹر گاڑیوں کے انخلاء کے وقت ذرا بدمزگی ہوئی۔ وہ یوں کہ ایک نواب زادے نے موٹر کو موڑتے ہوئے ایک بوڑھے گداگر کو کچل کر اسے کشمکشِ زیست سے آزاد کر دیا۔ اس کے

علاوہ ہاجرہ کا اکلوتا بیٹا مستو بھی نمونیہ کی تاب نہ لاکر قل خوانی کے اختتام سے کچھ دیر پہلے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا اولّ الذکر حادثے میں نگہدارانِ امن نے شریف پروری کرتے ہوتے گداگر کی موت کو مرگِ اتفاقیہ قرار دے کر رپٹ درج کرالی۔ مستو کی موت کوئی اتنی پریشان کن نہیں تھی کیوں کہ وہ شیخ صاحب کے اپنے گھر کا معاملہ تھا۔

ویر بھان

بعض دفعہ انسان اپنے معمولی تساہل کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت خطرناک حادثات ہوتے دیکھتا ہے۔ اگر عقل سلیم فوری طور پر فیصلہ نہ کر پائے تو ایک معمولی حماقت اسے بربادی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ ان مواقع پر تجربہ اور ذہانت ہی کام آسکتی ہے صرف اسی وجہ سے لوگ بڑے بوڑھوں کی عزت کرتے ہیں اور ان کی مدارات بھی تاکہ آڑے وقتوں میں وہ اُنہیں اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید کر سکیں۔ ویر بھان (جمعدار جیل) اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی اور تجربے کی بنا پر کئی دفعہ افسروں کو مصائب سے رہائی دلا چکا تھا۔ اس لئے بڑے صاحب سے لیکر معمولی عہدہ دار تک اس کی بڑی تکریم کرتے تھے۔ سب سے دلچسپ واقعہ اس دن پیش آیا جب اس بوڑھے جمعدار نے جیل کے حاکم اعلیٰ اور مجسٹریٹ علاقہ کو انتہائی سراسیمگی کی حالت میں دیکھا۔ اور پھر اس نے چند لمحوں میں اُنہیں اس پریشانی سے آزاد کرا دیا۔

احمد آباد کی جیل میں ایک قاتل لچھمن سنگھ کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ مقررہ تاریخ پر علی الصبح مجسٹریٹ علاقہ جیل میں آئے اور مجرم کو ملکِ عدم کی طرف روانہ کرنے کے انتظامات اور کاغذات ان کی نگرانی میں مکمل ہوئے۔ سیاہ فام پھانسی دینے والے کے علاوہ چار سپاہی۔ جمعدار ویر بھان۔ صاحب مجسٹریٹ علاقہ اور سپرنٹنڈنٹ جیل پھانسی کے وقت

مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے موقعہ پر پہنچ گئے۔ بدنصیب لچھمن سنگھ کو جب باہر لایا گیا تو اس نے ہلّڑ مچا دیا۔

ارے میں تو سات سال کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ مجھے کہاں پھانسی دینے لئے جا رہے ہو۔ ذرا عقل سے کام لو۔ ارے دیکھو تو سہی مجھے پھانسی کی سزا نہیں ہے۔

لچھمن سنگھ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنا زور لگا کر ان چار سپاہیوں سے اُلجھ رہا تھا۔ جو اسے تختۂ دار کی طرف کھینچ کر لے جانا چاہتے تھے۔ اس کا مضبوط اور توانا جسم اپنے دست و پا کی بندشوں کے باوجود اپنی چھاتی اور سر کے بل ان بے رحم سپاہیوں سے لڑ رہا تھا جو اسے نظر آ رہے تھے۔ اس غُل غپاڑے میں مجسٹریٹ نے سپرنٹنڈنٹ جیل کی طرف۔ اس نے ویر بھان کی طرف اور ویر بھان نے اپنے نائب جمعدار کی طرف تعجب سے دیکھا۔ نائب جمعدار نے فوراً انکشاف کیا۔

جناب! جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے اور اسے بچانے کے لِئے ہر آدمی کوشش کرتا ہے۔ اِس پاپی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ جھوٹ بکتا ہے سالا۔

”نہیں حضور! اپنے پتّر تو دیکھیں مجھے پھانسی نہیں ہونا ہے۔ بھگوان کے لِئے کرپا کرو۔ میرے ساتھ ظُلم نہ کرو۔“ لچھمن سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں چیخیں مارتے ہوئے کہا۔

بکواس نہ کرو۔ یہ وقت بھگوان کو یاد کرنے کا ہے۔ ان ڈھونگ بازیوں سے کام نہیں چلے گا۔“

صاحب سپرنٹنڈنٹ نے گرجتے ہوئے فرمایا۔

”جناب ذرا دیکھو تو سہی۔ اجی کیا ظُلم کر رہے ہو۔“

ایک سپاہی نے پیچھے سے بندوق کی بٹ سے لچھمن سنگھ کی کمر پہ ضرب لگائی کہ وہ ادھ موا سا ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو سپاہیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔

صاحب مجسٹریٹ دُور سے کھڑے دیکھتے رہے اور سگریٹ کے کش سے اس ہولناک منظر کے رُوح فرسا تاثرات کو زائل کرتے رہے۔

موت کا وقت بُرا وقت ہوتا ہے بڑے بڑے سورماؤں کے دل بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بیچارا کسی بہانے اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے۔ حاکم زندان نے مجسٹریٹ سے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"جی دُرست ہے۔" جواب مِلا۔

مُجرم کے کاغذات مکمّل کر دیئے گئے۔ ان مجسٹریٹ صاحب نے اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ اسے ٹوپی پہنائی گئی۔ اس کے گلے میں پھندا ڈالا گیا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے تختے سرکے اور وہ ایک جنبش کے ساتھ کنویں میں گر کر لٹک گیا۔ رسّے کو کچھ دیر جنبش ہوتی رہی۔ اس کے بعد وہ ساکت ہو گیا۔ جمعدار نے کنویں کے اندر جا کر اطمینان کر لیا کہ واقعی لچھمن سنگھ سورگ باش ہو چکا ہے۔ پھانسی کی کارروائی ختم ہو گئی۔ مصیبت اس وقت پیش آئی جب لچھمن سنگھ کی لاش اس کے ورثا کے حوالے کی جانے لگی۔ جیل کے بڑے دروازے کے باہر روتے چیختے مَردوں اور عورتوں کا مجمع اکٹھا تھا۔ جب اِس بدنصیب مجُرم کی لاش جیل کے باہر لا کر دکھائی گئی تو اُنہوں نے اور بھی زیادہ واویلا کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ یہ ان کے لچھمن سنگھ کی لاش نہیں تھی۔

سپاہیوں کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ اور وہ اس لاش کو اُٹھا کر فوراً جیل کے اندر واپس آ گئے۔ اور بڑا دروازہ بند کر دیا۔ جب مجسٹریٹ صاحب اور سپرنٹنڈنٹ جیل پر اِس فروگذاشت کا انکشاف ہُوا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ نوکری سے برخاستگی۔ بربادی، قید ذلّت اور خواری یہ سب کچھ ان کے سامنے تھا۔ بظاہر کوئی رستہ اس مصیبت سے چھٹکارے کا نہیں تھا۔ کیونکہ ان کے پاس اس سنگین بے ضابطگی کا کوئی جواب نہیں تھا۔

جیل کا دروازہ لچھمن سنگھ کے وارث توڑ رہے تھے۔ اندر ایک بے گُناہ شخص کو بغیر کسی وجہ کے پھانسی دی جا چکی تھی اور اس کی لاش کو اپنانے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔

زندان کے حاکم اور مجسٹریٹ پر وہی عالم طاری ہو گیا۔ جو لچھمن سنگھ متوفی پر پھانسی سے

قبل تھا۔ اُن کی زبانیں گنگ ہوگئیں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دُوسرے کو تک رہے تھے۔ اس صُورتِ حال میں صرف ایک شخص تھا جس کا سکُون بحال تھا اور وہ جمعدار ویر بھان تھا جو انتہائی دلچسپی کے ساتھ اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چپکے سے ان دونوں افسروں کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"آپ کو کیا دُکھ ہے؟ کون سا راجواڑہ مرگیا ہے۔ جس کے سوگ میں اتنے ہلکان ہو رہے ہیں آپ؟"

"ویر بھان! تُم دیکھ رہے ہو۔ ہم نے غلط آدمی کو پھانسی دے دی۔" سپرنٹنڈنٹ جیل نے سراسیمگی کے عالم میں جواب دیا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ اتنے بڑے افسر ہو کر اتنے ڈرپوک ہیں۔ یہ تو بھول چوک ہے۔ مَیں ایک منٹ میں سارا کام سیدھا کر دوں گا۔ یہ کہہ کر ویر بھان مُسکرا دیا۔

جمعدار جی! آپ کوئی راستہ بتا سکتے ہیں۔ مجسٹریٹ صاحب نے پُوچھا۔

"مَیں یہ مصیبت ابھی دُور کئے دیتا ہُوں لیکن وعدہ کریں آپ میری ہمیشہ خدمت کریں گے۔ افسر لوگ کام نِکلنے کے بعد کِسی کے واقف نہیں بنتے۔" جمعدار ویر بھان نے معنی خیز انداز میں ارشاد فرمایا۔

چھوڑو جمعدار جی! اب بھی کوئی مذاق کا وقت ہے۔ ہم تُمہارے تابعدار ہیں۔ ہماری جان چھڑاؤ کِسی طرح سے۔" مجسٹریٹ صاحب نے جمعدار کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر لجاجت سے عرض کی۔ آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ مَیں ابھی سارے کام کِئے دیتا ہُوں۔ افسران نے جمعدار کے حُکم کی تعمیل کی۔ جمعدار صاحب اصلی لچھمن سنگھ کو ڈھونڈھنے کے لِئے چار سپاہیوں کو لے کر بیرکوں میں چلے گئے۔ پانچ منٹ کے بعد اسے اندر سے کھینچ کر باہر لے آئے اور سیدھے تختہ دار کی طرف لے گئے۔ بغیر کِسی رسمی کارروائی کے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر دار پر کھینچ دیا۔ دو چار لمحات زندگی اور موت کی کشمکش میں مُبتلا رہ کر یہ لچھمن سنگھ بھی اپنے ہم نام کے ساتھ

جا ملا۔ رہے نام پرماتما کا۔ دُوسری لاش جیل کے دروازے کے باہر لچھمن سنگھ کے منتظر رشتہ داروں کے حوالے کر دی گئی جسے وُہ اُٹھا کر روتے پیٹتے چلے گئے اور جیل کا گیٹ پھر اندر سے بند کر دیا گیا۔ اب باہر تو خیریت ہو گئی، لیکن جیل کے اندر ایک جرم کو چھپانا مقصود تھا۔ جمعدار دیر بھان اس کے لئے بھی تیار تھا۔ اس نے ایک رسّہ مُردہ لچھمن سنگھ کی گردن میں ڈالا اور اس کی لاش کو جیل کی ایک کوٹھری میں لٹکوا دیا۔ لچھمن سنگھ کی لاش کوٹھڑی میں دائیں بائیں جھُول جھُول کر جمعدار کی دانشمندی کا اعلان کرنے لگی۔ اس کارروائی کے بعد جمعدار ویر بھان مسکراتا ہُوا دفتر کے اندر آیا۔ جہاں دونوں حاکم امید و بیم کے عذاب میں مُبتلا تھے۔ وہ مسکرا کر اُن کے ساتھ بیٹھ گیا اور اپنی کارکردگی ان الفاظ میں پیش کی۔ جس آدمی کو آج پھانسی دی گئی ہے اس کی لاش حُکم کے مُطابق وارثوں کے حوالے کر دی گئی ہے لیکن ایک دُوسرا افسوسناک واقعہ بھی یہاں جیل میں ابھی پیش آیا ہے اور وہ یہ کہ ایک اور لچھمن سنگھ نامی قیدی نے اپنے گلے میں رسّہ ڈال کر خُودکشی کر لی ہے۔ اتفاق سے مجسٹریٹ صاحب موجُود ہیں اور وہ خُود موقع ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ جیل کے چہرے خُوشی سے تمتما اُٹھے۔ اُنہوں نے ویر بھان سے تحریری رپورٹ لے کر مُلاحظہ کی۔ صاحب مجسٹریٹ کی تحقیقات پر ثابت ہوا کہ جمعدار کی رپورٹ دُرست ہے اور متوفی نے واقعی خُودکشی کی ہے۔

خس کم جہاں پاک

سردارا چپراسی

کلب کے باہر سرکلر باغ کے ایک پلاٹ میں شام کے وقت تین آدمی شراب کے نشے میں بدمست محوِ گفتگو تھے۔ میں نے ذرا دُور بیٹھ کر ان کے حرکات و سکنات کا انتہائی دلچسپی کے ساتھ جائزہ لیا۔ میری سمجھ میں یہی کچھ آیا کہ ان میں جو صاحب بہ آوازِ بلند خطاب فرما رہے ہیں وہ مال کی کسی بڑی عدالت کے چپراسی ہیں۔ باقی دو صاحبان ان کے رشتے دار ہیں جو اُنہیں کسی دُور کے ضلع سے مِلنے کے لِئے آئے ہیں اور گھر سے پتہ لیکر وہ اُنہیں ڈھونڈتے ہُوئے یہاں آ گئے تھے۔ جہاں چپراسی صاحب نے دُخترِ رز سے ان کی تواضع کی۔ چپراسی صاحب اپنے رشتے داروں کو اپنے بلند منصب۔ اس کی ذمہ داریوں اور ذرائع آمدنی کی تفصیلات بیان کر کے مرعُوب فرما رہے تھے۔ شراب کے نشے میں دلچسپ حقائق کا بے تکلف اظہار میرے لِئے نہایت بصیرت افروز ثابت ہُوا۔ ممدوح سردار خاں چپراسی فاتحانہ انداز میں یُوں رطب اللّسان تھے۔

مُجھے اس شہر میں رہتے ہُوئے پانچ چھ سال ہو گئے ہیں۔ میں اس کی ہر سڑک اور ہر گلی سے واقف ہوں۔ بڑے بڑے افسر میری خوشامد کرتے ہیں کیوں کہ میرا صاحب اگر چاہے تو اُنہیں ایک منٹ میں برخاست کر سکتا ہے۔ لاکھوں رُوپے کی جائیدادوں کے

مقدمات ہماری عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار اپنی مطلب برآری کے لئے میری خدمت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن میں ان کی کبھی پروا نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کام نکل جانے کے بعد لوگ آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

اس موقع پر سامعین میں سے ایک نے سردار خاں سے دریافت کیا۔

کیا آپ کے صاحب بہادر مقدمات کا فیصلہ آپ کی مرضی کے مطابق کر دیا کرتے ہیں۔"

اس سوال پر سردار خاں کھلکھلا کر ہنسا۔

مجھے صاحب کو کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔؟ مجھے اکثر مقدمات کے دونوں فریق آ کر مل لیتے ہیں۔ پیشگی رقم تو میں دونوں سے وصول کر لیتا ہوں۔ بقیہ رقومات دفتر کے باہر چوک کے مختلف دوکانداروں کے پاس بطور امانت رکھ دی جاتی ہے۔ جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوا اس کی رقم مجھے مل جاتی ہے۔ جس کے خلاف ہوا وہ اپنی رقم واپس لے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میری آمدنی کے اور بہت سے ذرائع ہیں جن کے بغیر اتنے بڑے شہر میں بسر اوقات ہونا ناممکن ہے۔ جن ماتحت افسروں کے خلاف ہماری عدالت میں کارروائیاں زیر کار ہوتی ہیں وہ بھی میری بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ یہ لوگ توقع کرتے ہیں۔ کہ میں جو صاحب کے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہمراہ ہوتا ہوں ان کے بارے میں سفارش کے کچھ کلمات کہہ کر ان کی اعانت کا ذریعہ بن سکوں گا۔ یہ لوگ مختلف اضلاع سے مختلف تحائف لیکر میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ میاں! یہ سب کچھ اللہ کی دین ہے۔ ورنہ میں کیا شئے ہوں۔ کسی دن تو وہ ہن برستا ہے کہ شام تک طبیعت باغ و بہار رہتی ہے۔ دفتر کے بعد جب میں بھری ہوئی جیبوں کے ساتھ اپنی بیوی سے جا کر ملتا ہوں تو سارے دن کی تکان دور ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس کوئی دن ایسا بھی آتا ہے کہ پھوٹی کوڑی بھی میسر نہیں آتی۔ صاحب کا پیش کار اگر کوئی معقول آدمی ہو تو آمدنی کے ذرائع زیادہ

وسیع ہو جاتے ہیں۔ مقدمے کے فریقین ہر حالت میں تاریخ وغیرہ کے سلسلے میں اس کے سامنے پیش ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ ان کو میری طرف اشارہ کر کے اتنا ہی کہہ دیتا ہے۔ یہ اردلی صاحب کا خاص آدمی ہے اور بس۔ اس کے بعد یہ لوگ میرا گھر پوچھتے ہوئے مجھ سے آملتے ہیں اور میں اپنا اور منشی جی کا حق الخدمت متعلقین سے وصول کر لیتا ہوں۔ مقدمے ہر شخص کی قیمت پر فیصل ہوتے ہیں۔ میں ہرگز اپنے صاحب سے مقدموں کی بات نہیں کرتا۔ صرف اتنی کوشش کرتا ہوں کہ جن لوگوں کے حق میں فیصلہ ہو۔ اُنہیں یہ یقین ہو جائے کہ اُن کی کامیابی میں میرا بھی ہاتھ کارفرما تھا۔

کوئی ایسا بھی تو ہو گا جس کی آپ دل سے امداد کرتے ہوں گے؟

میں اپنے دوستوں کی پوری امداد کرتا ہوں لیکن یہ امداد اکثر بیگمات کی معرفت ہوتی ہے۔ صاحب اکثر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف طبائع کے ہوتے ہیں کچھ وہ ہوتے ہیں جو غریب نواز ہوتے ہیں اور ہمارا چھوٹا موٹا کہنا مان بھی لیتے ہیں۔ ہم بھی ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ہماری وجہ سے ان کے گھر کا خرچ آدھے سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ ایسے صاحب تبدیل ہو جانے کے بعد بھی مجھے خط لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی بیگمات مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں۔ میں نے بھی اُنہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ گھر کا خرچ خود بخود چلتا رہتا ہے۔ اور اُنہیں ذرا بھی گھریلو معاملات سے متعلق دشواری پیش نہیں آتی۔ بعض دفعہ مہربان بیگمات کا اعتماد حاصل ہونے پر اسامیوں کو ان کا سلام بھی کروا دیتا ہوں۔ اہلِ غرض مجنوں ہوتے ہیں۔ وہ صرف اسی بات پر مجھے سینکڑوں روپے دے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار میں واقعی اپنے دوستوں کے کام آ بھی جاتا ہوں لیکن وہ صرف اسی صورت میں جب صاحب کی بیگم اس امداد کی حامی بھرلے۔ بعض بیگمات بڑی بدخو ہوتی ہیں۔ اُن سے تعاون کی قطعی اُمید نہیں ہو سکتی۔ ایسی عورتوں کو ہم بازار سے دو آنے کی چیز چار آنے میں لا کر دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ خاندانی افسران کی بیگمات ماتحت پرور ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے ملازموں کی بھلائی میں خوش ہوتے ہیں اور کوتاہیوں پر چشم پوشی کرتے ہیں۔

لیکن بعض دفعہ معمولی گھرانوں کے لوگ بھی افسر بن کر آجاتے ہیں۔ یہ نامُراد خود بھی بھوکوں مرجاتے ہیں اور ماتحتوں کے لئے بھی وبالِ جان ہو جاتے ہیں۔ ایسے افسروں کے وقت میں میری آمدنی ماند پڑ جاتی ہے لیکن میں ان کے گھر کا کام کاج قطعی نہیں کرتا۔ کیونکہ میں سرکاری ڈیوٹی کا پابند ہُوں۔ کسی کا نجی مُلازم نہیں۔ مہمانوں میں سے ایک نے دریافت کیا۔

"ایسے دیانتدار افسروں کے زمانے میں تو صرف تنخواہ پر ہی گزرتی ہوگی؟"

سردار خاں نے سگریٹ کا کش لگایا اور پھر سرگرم گفتار ہُوا۔

ارے بھائی! اللہ سب کا پالنے والا ہے۔ ہر وسیلے سے اپنے بندے کو رزق پہنچاتا ہے۔ گوشت کھانے والے کو گوشت دیتا ہے۔ اس کریم و رحیم خدا نے میرے واسطے بھی بہت سی راہیں کھول رکھی ہیں۔ مثال کے طور پر میری آمدنی کا ایک اہم جزو وکلاء سے متعلق ہے۔ میرا یہ کاروبار خواہ مہربان ہو یا نامہربان بارہ مہینے جاری رہتا ہے۔

سامعین ہمہ تن متوجّہ تھے۔ سردار خاں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہُوئے فرمایا۔

اس شہر میں ایسے وکیلوں کی کمی نہیں جنہیں مہینوں کسی مؤکل کی صُورت نظر نہیں آتی۔ اِن میں سے چند میرے دوست ہیں۔ جن کے ساتھ میری خُوش معاملگی ہے۔ میں انہیں مؤکل بھیجتا ہُوں اور وُہ اپنے حق الخدمت بطورِ کمیشن ادا کرتے ہیں۔ قسمت کے مارے فریقین مقدمہ ان پڑھ چھوٹے زمیندار، تقسیم اراضی کے چکّر میں پھنسے ہُوئے مہاجر۔ مقدمہ کی ابتدا میں ہمارے پاس آکر ضرور بیٹھتے ہیں۔ ان کا مقصد ہم سے افسرِ اعلیٰ کے لئے سفارش کا کھوج لگانا ہوتا ہے یہ فراخ دل، منکسر المزاج متعلقین تنازعہ ہمیں مقدمے کے دوران میں کچہری کے باہر اور اکثر شام کے وقت ہمارے مکانوں پر آجاتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو ان وکلاء کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ جن سے تعلّقات ہیں ان آسامیوں کو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ فلاں وکیل صاحب ہمارے افسرِ اعلیٰ کے رشتے دار ہیں یا دوست ہیں۔ ہمارے کہنے پر شکار خود وکیل صاحب کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہو جاتا ہے اور ہمارے وارے نیارے

ہو جاتے ہیں۔ مقدمہ کوئی ہارے یا جیتے یہ اس کی قسمت پر موقوف ہوتا ہے۔ ہمارا رزق ہر حال میں پہنچ جاتا ہے۔

سردارا اپنے بخت رسا کی کامرانیوں میں گم تھا کہ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کے صاحب بہادر جو جام و مینا کے فیض سے جھوم رہے تھے اور دنیا و مافیہا کے ہر معاملے سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ کلب سے لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلے اور شور مچانے لگے۔

"ابے او سردارے کے بچّے کہاں مر گیا ہے تو۔"

سردارا اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر صاحب کی طرف دوڑا۔

"حضور میں جناب کے حکم سے یہاں بیٹھا ہوں۔"

سردارا بھی نشے میں مدہوش تھا۔

"ارے تم نے بھی شراب پی لی ہے؟۔ معلوم ہوتا ہے میری وسکی کا جو ادّھا تمہارے پاس تھا وہ تم نے حلق میں اُتار لیا ہے۔"

"میں حضور کا نمک خوار ہوں۔ میرے رشتے دار آ گئے تھے۔ میں نے وہ شراب خود بھی پی ہے اور انہیں بھی پلا دی ہے۔" سردارا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔

"کمینے! تو دو پیسے کا چپراسی ہو کر میری ساٹھ روپے کی بوتل پی گیا ہے۔؟ بدمعاش کمیں کا۔ یہ رقم تمہاری تنخواہ سے وضع کروں گا۔"

یہ کہہ کر صاحب اپنی کار میں سوار ہو گئے جو کچّی روش کی مٹّی اُڑاتی ہوئی باغ سے باہر نکل گئی۔ سردارا اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آیا اور اپنے پریشان مہمانوں کو کھسیانی ہنسی کے ساتھ تسلی دے کر کہنے لگا۔

یہ ہنسی مذاق ہمارے ساتھ روز ہوتا رہتا ہے۔ صاحب بہت مہربان افسر ہے۔ تم مت گھبراؤ۔ میری خیر خیریت تو تم نے دیکھ ہی لی ہے۔ تم وطن سے آئے ہو۔ اب تم اپنی خیر خیریت کا احوال سناؤ۔

بگّو میراثی

اصل نام قلندر علی ہے۔ بچپن کی غیر معمولی سپیدی کی بنا پر ماں باپ بگّا کہتے تھے۔ بگّا سے بگّو ہو گیا اور آج تک بگّو ہی کہلاتا ہے۔ بچپن نہایت امیرانہ ٹھاٹ میں گزرا۔ سمند خاں سیال بہت بڑا زمیندار تھا۔ اور بگّو کی ماں دولاں اس کی محبوب داشتہ تھی انواع واقسام کے کھانے زرق برق لباس۔ نوکر چاکر اور موٹر گاڑیاں موجود تھیں۔ پانچ سال تک بگّو کو یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ ایک غیر منکوحہ میراثن کا بیٹا ہے۔ اور یہ کہ اس کا یہ سب ناز و نعم اس کی ماں پر سمند خاں کی خاص توجّہ کے باعث ہے۔

جب بگّو پانچ سال کا ہوا تو سمند خاں نے دولاں سے آنکھیں پھیر لیں۔ دولاں جس قدر سامان سمندر خاں کے گھر سے اُٹھا سکتی تھی سمیٹ کر اپنے میکے میں لے آئی۔ بگّو کو یکدم معلوم ہوا کہ اس کی زندگی میں انقلاب آ گیا ہے۔ کہاں وہ شاہانہ ٹھاٹھ۔ رزق کی فراوانی اور جملہ آسائش کے سامان اور کہاں یہ میراثیوں کے غلیظ گھروندے جو ہمہ قسم کثافتوں کی آماجگاہ تھے۔

آہستہ آہستہ بگّو اپنے ماحول سے مانوس ہوتا گیا۔ لوگ اکثر شراب کے نشے میں دھت ہو کر اس کے گھر آتے اور اس کی ماں سے تخلیے میں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ رفتہ رفتہ بگّو اِن لوگوں سے اتنا گھل مل گیا کہ اسے سمندر خاں کی یاد بھول گئی۔ سرمایہ دار کسی کا باپ

نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت بگو پر چھوٹی عُمر ہی میں روشن ہوگئی۔ عصمت فروشوں کے محلّے کے ماحول نے بگو کو بہت جلد اپنے سلپچے میں ڈھال لیا۔ اس نے آٹھ سال کی عُمر میں سگریٹ پینا شروع کر دیئے اور بارہ سال کی عُمر میں بھنگ اور چرس سے متعارف ہوگیا۔ وُہ اجنبی لوگوں سے رقم بٹورنے کے فن میں طاق ہوگیا اور اپنی ماں کی ہدایات کے مطابق ان شب زندہ دار بھلے مانسوں کی خاطر مدارات میں بڑا مشاق ہوگیا۔ جن کا گذر اس کے محلّے میں رات کی تاریکیوں میں ہوتا تھا۔ اپنی ماں کے علاوہ محلّے کی دیگر میراثنوں کے گھرانوں میں بھی بگو کی آمدورفت بڑھتی چلی گئی۔ وُہ ان کے گاہکوں کی بھی دروازے تک رہبری کرتا اور ان کی سیوا کر کے کافی کچھ بنا لیتا۔ بگو کی ماں کا کاروبار سرد ہونے سے پہلے اس کی دو بہنیں جو مہر سمند کے گھر میں پیدا ہوئی تھیں۔ جوان ہوگئیں اور بگو کے گھر والوں کے دُکھڑے ٹل گئے۔

بگو کی بڑی بہن پر شہر کے ایک مُعمر نواب کی نظر پڑی جس کی جائیداد اور مال و متاع کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اور سرکار دربار میں کافی رسائی تھی۔ نواب صاحب کے گھر میں بگو کے گھر والوں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ بگو کے دن پھر گئے۔ اب بھنگ اور چرس کی جگہ بگو انگریزی شراب پینے لگا۔ اس کی جیبوں میں سینکڑوں کی مالیت کے نوٹ نظر آنے لگے۔ نواب صاحب کی غریب نوازی کے تصدق میں بگو کی ماں نے اپنے محلّے میں پکا مکان تعمیر کر لیا اور بگو کے لئے دو ہزار میں ایک غریب میراثی کی لڑکی جو چنداں جاذب نظر نہیں تھی اور جس سے کسی بڑی کمائی کی اُمید بھی نہیں تھی۔ خرید کر لی گئی۔ میراثی اپنی بہوؤں سے دھندا نہیں کراتے اس لئے شادی صرف انہیں میراثنوں کی ہوتی ہے جو شکل و صورت کے اعتبار سے جاذب نظر نہیں ہوتیں۔

میراثنوں کی شادی پر بڑی دھوم دھام ہوتی ہے۔ بگو کی شادی پر بھی بڑے تزک و احتشام کا مظاہرہ کیا گیا۔ بگو کی بہنوں کے آشناؤں نے اس کی شادی میں دل کھول کر خرچ کیا۔ اور وہ رنگ رلیاں منائی گئیں کہ محلّے میں شادی یادگار بن کے رہ گئی۔ وُہ اصلی بوسکی

کی قمیص اور ریشمی لنگی کے علاوہ کمخواب کی واسکٹ پہن کر شہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ بہنوں کے خریدار اکثر اپنے ساتھ شراب کی بوتلیں لے آتے تھے۔ اُن کی رنگ رلیوں سے بچی ہوئی مئے ناب بگو کے لئے کافی ہوجاتی تھی۔ بگو کے گھر میں سارا دن حُسن برستا تھا۔ اور وُہ اپنی زندگی آسودگی کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ انہی ایام میں بگو کو اطلاع ملی کہ سمند خاں سیال جو اس کا باپ تھا بیمار ہو کر شہر آگیا ہے۔ مہر صاحب نے شہر میں ایک مکان کرایہ پر لیا اور علاج کے لئے دو چار ماہ کی مستقل رہائش کا انتظام کر لیا۔ اس کے ہمراہ اُس کے دو نوجوان بیٹے جو اس کی منکوحہ بیوی کے بطن سے تھے۔ دیکھ بھال کے لئے ساتھ آئے۔ مہر سمند نے اپنے اپنے گذشتہ تعلقات کی بنا پر بگو اور اُس کی ماں کو یاد فرمایا۔ یہ سارا کُنبہ مہر صاحب کی مزاج پرسی کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ پُرانی صحبتیں یاد آئیں۔ مہر صاحب نے بگو پر بڑے التفات کا مظاہرہ کیا اور اُس کا اپنے بیٹوں سے تعارف کرایا۔ مہر صاحب کی بیوی نے بھی دو لاں پر بڑی شفقت کی اور بگو کی ماں کو ایک ریشمی جوڑا اور پچاس رُوپے بخشے۔ بگو کو بھی مہر سمند نے ایک سو رُوپیہ عنایت کیا اور اسے ہدایت کی کہ وُہ روزانہ ان کے گھر میں کام کاج کرنے کے لئے آجایا کرے۔ مہرانی صاحب کے ارشاد کے مُطابق بگو نے اپنی بیوی مہر صاحب کے گھر میں کام کاج کے لئے بھیج دی۔ مہر صاحب کی علالت طویل ہوتی چلی گئی اور وُہ دیہات چھوڑ کر شہر میں مستقل رہائش اختیار کر گئے۔ بگو کا کُنبہ دیرینہ تعلقات کی بنا پر ان کی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔ مہر صاحب کے فرزند بھی بگو کے گھر میں آنے جانے لگے۔ چند دن گزرنے کے بعد بگو کو احساس ہُوا کہ اس کی بیوی مہر سمند کے ساتھ ضرورت سے زیادہ گھل مل گئی ہے۔ لیکن بگو کسی حالت میں بھی کسی قسم کا شک کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کیونکہ مہر صاحب اس کے باپ تھے اور باپ سے ایسی توقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح مہر صاحب کے بیٹوں کی بھی اس کی بہنوں پر ضرورت سے زیادہ شفقت اسے تعجب انگیز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کیوُں کہ یہ سب لوگ بہن بھائی تھے۔ ایک باپ کی اولاد۔ وقت گذرتا چلا گیا اور پوشیدہ امور خود بخود

واضح ہوتے چلے گئے۔ ایک رات بگوّ کی بہنوں اور مہر صاحب کے بیٹوں کی پُر اسرار گمشدگی مہر سمند کے لئے شدید پریشانی کا باعث بن گئی۔ مہر صاحب کو بھی پُورا علم تھا کہ لڑکیاں دولاں کے بطن سے تب پیدا ہوئی تھیں۔ جب وہ مہر صاحب کی داشتہ تھی۔ اپنے لڑکوں کی ذلیل حرکت پر مہر صاحب کو وہ صدمہ ہُوا جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اِدھر مہرانی صاحب اپنے لڑکوں کو بیگناہ سمجھتے ہُوئے سارا الزام بگوّ کی بہنوں کے سر تھوپ رہی تھی۔ اس کے خیال میں ان خبیث لڑکیوں نے دولت کے لالچ میں اس کے بیٹوں کو بُرے راستے پر لگایا تھا۔

بگوّ کو اپنی بہنوں کے اغوا کا صِرف مالی نقصان کی حد تک احساس تھا کیونکہ ان کے چلے جانے سے اس کے ذرائع آمدنی مسدود ہو گئے تھے۔ ورنہ وہ بذاتِ خود اتنا فراخ دل۔ مرنجاں مرنج۔ آزاد خیال۔ بے شر اور بے ضرر انسان تھا۔ جس کے نزدیک اس کی بہنوں کا اغوا چنداں پریشان کُن امر نہیں تھا۔ اسے گھر کی مالی سبیل ضائع ہونے کا افسوس تھا۔ ورنہ سیال خاندان کے ساتھ ان کے پُرانے تعلق تھے اور اسے اس میں کوئی عذر نہیں تھا کہ اس کی بہنیں اسی گھر میں جوانی کے ایّام گزاریں جہاں اس کی ماں کا عہدِ شباب گزرا تھا۔ مہر سمند نے بگوّ اور اس کی ماں کو کچھ دے دلا کر ان کی اشک شوئی کی اور لڑکیوں کی واپسی کا وعدہ کیا لیکن وُہ شہزادے اپنی محبُوب عورتوں کو لیکر اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ مہر صاحب کی مالی امداد اور خصُوصی توجہ کی بنا پر بگوّ اور اس کی ماں صبر کر کے بیٹھ رہے۔ اگر اِسی پر یہ معاملہ ختم ہو جاتا تو خیریت تھی۔ لیکن تقدیر کو ایک اور گُل کھلانا مقصُود تھا۔ ڈاکٹروں نے مہر صاحب کو صُوبائی دار الحکُومت میں جانے کا مشورہ دیا اور مہر صاحب اپنی بیوی کو وہیں چھوڑ کر بگوّ کی اہلیہ کے ساتھ عازمِ سفر ہو گئے۔ کیونکہ یہ عورت جوان ہونے کی وجہ سے ان کے کام کاج اور تیمار داری کے لِئے بہت موزوں تھی۔ مُبلغ پانچ سو رُوپے کی ماہانہ رقم سے بگوّ اور اُس کی ماں کے مُنہ کو بند کر دیا گیا۔ اُنہوں نے مہر صاحب کے آرام و آسائش کے لِئے بگوّ کی بیگم کی جُدائی بھی گوارا کر لی۔ مہر صاحب کچھ عرصہ خط و کتابت

کرتے رہے اس کے بعد انہوں نے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا۔ بگوؔ کی بیوی کے متعلق صرف اتنا معلوم
ہو سکا کہ وُہ اس منصب پر فائز ہو چکی ہے جہاں آج سے بیس برس پہلے بگوؔ کی ماں جلوہ افروز
تھی۔ اپنی بہنوں اور بیوی کے اغوا کے بعد بگوؔ کا کُنبہ بیکار ہو گیا۔ اب اس کی ماں محلّے کی
دیگر لڑکیوں کے کاروبار میں دلّالی کرتی تھی۔ بگوؔ سارا دن چرس کے نشے میں دھت سڑکوں پر آوارہ گردی
کرتا رہتا۔ اپنے اور مہر صاحب کی مُرکّب رشتہ داریوں پر تنہائی میں غور و فکر کیا کرتا تھا۔ جب فاقوں
تک نوبت پہنچی تو بگوؔ نے اپنی ماں سے مشورہ کر کے مہر سمند کے خلاف اپنی بیوی اور اس کے
بیٹوں کے خلاف اپنی بہنوں کے اغوا کے مقدمات دائر کر دیئے۔ جب عدالت سے سمن جاری
ہُوئے تو سمند خاں اور اُس کے بیٹوں کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ نمبرداریوں اور یُونین کونسلوں کی
ممبریوں کے بھرم نے مجبور کیا۔ سمند خاں معہ شہزادوں اور متعلقہ عورتوں کے شہر میں وارد ہُوئے
اور سیدھے میراثیوں کے گھر میں جا اُترے۔ اُنہوں نے ہر شرط پر تصفیہ قبول کرنے پر آمادگی کا
اظہار کیا۔ سمند خاں کی آمد سے اُجڑے ہُوئے گھر میں پھر بہار آ گئی۔ سب اکٹھے ہو کر بیٹھے۔ متعلقین
نے ہزار ہزار قسمیں کھا کر اپنے خلوص اور نیک نیتی کا ایک دُوسرے کو یقین دلایا۔ تین گھنٹے کی
بحث و تمحیص کے بعد جب فریقین دل کھول کر گلے شکوے کر چکے تو یہ طے ہُوا کہ دولاں اور بگوؔ
مہر سمند کے موضع میں چلیں۔ دولاں سمند خاں کے گھر کے کام کاج کی منتظمہ بن کر رہے اور بگوؔ
سمند خاں کے بیٹوں کے ساتھ بطور کار دار کے کام کرے۔ عورتوں اور مردوں نے شراب کے
نشے میں دھت ہو کر دُعائے خیر پڑھی۔ مقدمات بگو کی درخواست پر داخل دفتر ہُوئے اور وُہ
اپنی ماں کے ساتھ دوبارہ نقلِ مکانی کر کے اپنے پیدائشی مسکن کی طرف روانہ ہُوا۔ بہنیں اور بیوی
پہلے ہی وہیں تھیں۔ اب سارا کنبہ پھر ایک جگہ جمع ہو گیا۔ بگو کو اب روٹی، کپڑے، نشے اور تمباکو
کی کوئی فکر نہ رہی اور اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اس کے دن بدل چکے تھے۔ کھانے
پینے کی فراوانی سے اس کا سپید رنگ پھر نکھر آیا۔ خوش لباس تو وُہ پہلے ہی تھا۔ دن میں ایک دو
دفعہ غسل کرنے کے بعد جب وہ ریشمی تہبند اور ریشمی کُرتا اور پگڑی باندھ کر باہر نکلتا تو وہ سمند خاں

کے بیٹوں سے زیادہ جاذبِ نظر معلوم ہوتا۔ اس کی دیہاتی بیوی سمند خاں سے آنکھ بچاکر اس پر بھی گاہے گاہے نوازشات کرتی رہتی۔ اِدھر سمند خاں بھی از راہِ غریب نوازی بگو کی ماں کے پُرانے تعلقات کے احترام میں اُس کی مزاج پُرسی لیتا تھا۔ بہرحال جو بھی کہیں تھا۔ خُوش و خرم تھا۔

انہیں ایام میں سمند خاں کی چھوٹی سوتیلی ہمشیرہ نُوراں جو دُور کسی گاؤں میں ایک بوڑھے زمیندار سے بیاہی ہوئی تھی بیوہ ہو کر میکے واپس آئی۔ اُس کا کوئی بال بچہ نہیں تھا لیکن اُسے اپنے مالدار خاوند کی وراثت میں کافی جائیداد ملی تھی۔ اس لحاظ سے وہ سمند خاں سے بھی زیادہ متموّل اور آسُودہ حال تھی۔ دولت مند رشتے دار ہر ایک کو پیارے لگتے ہیں۔ سمند خاں بھی اپنی بہن کی ہر قسم کی دلداری اور خدمت گزاری کرنے لگا۔ بہن نے سمند خاں کی حویلیوں سے الگ ایک نئی حویلی تعمیر کرائی اور اپنی خادماؤں کے ساتھ بڑے شاہانہ ٹھاٹھ سے وہاں رہنے لگی۔

بگو اُپنے سوتیلے بھائیوں کی سرد مہری سے کچھ شاکی ہونے لگا۔ اِدھر مہرانی نُوراں کو اپنی حویلی کی دیکھ بھال کے لئے اور جائیداد کے انتظام کے واسطے ایک مخلص اور وفادار منتظم کی ضرورت تھی۔ چُنانچہ مہر سمند نے ہمشیرہ کی استدعا پر بگو کو اپنی پھُوپھی کی خدمت میں بھیج دیا اور اِس طرح اس سے اپنی گلو خلاصی کر لی۔

دولاں سمند خاں کو روٹی کپڑے کے عوض مہنگی نہیں تھی۔ اِدھر بگو کو پھُوپھی نُوراں کے گھر میں پُوری معتبری حاصل ہو گئی۔ وہ اپنے سوتیلے بھائیوں سے زیادہ آسودگی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ بگو کو اپنی پھُوپھی نُوراں کی صحبت اس قدر راس آئی کہ وُہ اپنے تمام دُکھڑے بھُول گیا اور کئی کئی دِن حویلی سے باہر بھی نہ نکلتا۔ اب اس کے آگے کئی نوکر چاکر تھے جو اس کے حُکم کی تکمیل میں حاضر رہتے تھے۔ اِدھر مائی نُوراں بگو کو اپنے بھائی کا بیٹا سمجھ کر حد سے زیادہ پیار کرنے لگی اور گاؤں کے لوگوں کا خیال ہونے لگا کہ اسے شاید اپنا متبنّٰی بنا کر اپنی سالم جائیداد کا وارث قرار دے دے گی۔

ایک سال کے عرصے میں لوگوں میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں بگّو اور نوُراں ایک لمحہ کے لئے بھی ایک دُوسرے سے جُدا نہیں ہوتے تھے اور اب ان کے تعلّقات پر ماں بیٹے کے رشتے کے علاوہ کچھ اور بھی شک ہونے لگا لیکن مائی نوُراں کیونکہ صاحبِ جائیداد اور دولتمند تھی اس کے خلاف مُنہ سے آواز نکالنا بہت مُشکل تھا۔ اِدھر مہر سمند اس بات کو تصور میں بھی نہیں لا سکتا تھا کہ ایک میراثن کا لڑکا اس کی باوقار بہن کو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے گا اور پھر مائی نوُراں تو بگّو کی پھوپھی تھی۔ اس کے باپ کی بہن۔

ایک رات سمند خاں اپنی بیماری کے سلسلے میں پریشان ہو کر مائی نوُراں کے گھر میں اس نیّت سے داخل ہُوا کہ وُہ بگّو کو شہر میں کسی ڈاکٹر کے بُلانے کے لئے بھیجے۔ خادماؤں نے باہر کا دروازہ کھول دیا لیکن جب سمند خاں مائی نوُراں کی حویلی میں گیا اور اُس نے مہرانی نوُراں اور بگّو کو ناقابلِ بیان حالت میں دیکھا تو اس کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ اُس نے اعلیٰ حوصلگی کا مظاہرہ کیا اور چُپکے سے گھر واپس آ گیا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بگّو اُس کا بیٹا ہی نہیں تھا۔ اپنی بیوی کے رشتے سے رقیب بھی تھا۔ اور اب بہنوئی بھی۔

حافظ جھکاؤ الدّین

والدین نے غالباً ان کا نام ذکاؤ الدّین رکھا تھا۔ لیکن لوگ اُنہیں جھکاؤ الدّین کہنے لگے۔ وہ خُود بھی اپنے کو موجُودہ نام سے ہی پُکارا جانا پسند کرتے تھے۔ حافظ یُوں کہ اُن کے دادا جیاؤ الدّین (ضیاء الدّین) واقعی حافظ تھے۔ جھکاؤ الدّین کو یہ لقب وراثتاً مِلا تھا۔ حافظ جی کے والد حافظ نہیں تھے لیکن وُہ بھی حافظ ہی کہلاتے تھے۔ تقسیم بّرِصغیر کے موقع پر وُہ روہتک سے قافلے کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اور یہاں ایک بہت بڑے شہر میں آباد ہو گئے۔ ان کے چاروں طرف انہی کے رشتے دار رہتے تھے۔ یہ محلہ اب روہتک کے قصائیوں کا محلّہ مشہُور ہے کیونکہ اُن کے اکثر رشتے دار گلئے کے گوشت کا دھندا کرتے ہیں لیکن قصائی کوئی ذات نہیں ہے۔ یہ تو پیشہ ہے ویسے تو آج دُنیا قصائی ہے۔ بہرحال حافظ جھکاؤ الدّین خاندانی آدمی ہیں۔ حافظ جی کی عُمر ستر سال سے کچُھ زیادہ ہے لیکن شکل وصُورت سے اب بھی جوان نظر آتے ہیں ـــــ چھ فٹ کا قد، لمبا چوڑا مضبُوط اور سڈول جسم۔ بڑی بڑی آنکھیں اور لمبی لمبی سفید مُونچھیں۔ گلے میں ایک میلا سا چکن کا کرتا۔ ہلکا سا تہبند۔ پاؤں میں ہوائی چپل اور سر پہ سندھی نمُونہ کی شیشوں والی ٹوپی۔ جب وُہ گھر سے نکلتے تو گلی کے لچّے لفنگے اُن کے ڈر سے چھُپ جاتے محلّے بھر

میں حافظ جی کی دھونس بندھی ہوئی تھی۔

حافظ جی مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ گو سوائے کسی کے جنازے میں یا عید کے دن وہ کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھے گئے۔ روزے اُنہوں نے زندگی میں آٹھ دس ہی رکھے ہوں گے۔ جن میں سے آدھے سے زیادہ بچپن کے زمانے میں پیاس کی مجبوری سے توڑ ڈالے تھے۔ لیکن اللہ بخش دینے والا مہربان ہے۔ حافظ صاحب کے دیندار ہونے میں کسی شک و شبہ نہیں۔ وہ مُسلمان اور اسلام کے لِئے ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیّار رہتے تھے اور اب بھی ہیں۔

حافظ جی کو چرس پینے کی عادت بچپن سے ہے۔ وُہ ہر وقت "کے ٹو" کے سگریٹ خالی کرتے اور بھرتے نظر آتے ہیں۔ اتنے دلیر ہیں کہ وُہ چرس کا کسی سے پردہ نہیں کرتے وہ چرس پیتے ہیں۔ دھندا نہیں کرتے۔ جُرم چرس کا بیچنا ہے۔ پینا نہیں۔ حافظ جی قانون سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ قوالیوں کے بڑے رسیا ہیں۔ پاکپتن کے عُرس پر ہر سال باقاعدگی سے جاتے ہیں۔ اور محلّے میں بلکہ شہر بھر میں جہاں کہیں محفلِ سماع کا انتظام ہو۔ حافظ جی نہا دھو کر اپنے چکن کے کُرتے کو صاف کرا کے عطر پھلیل لگا کے ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ حافظ جی جب وجد میں آتے ہیں تو قوالی کی رونق اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حافظ جی کے بغیر قوالی کی محفلیں پھیکی ہوتی ہیں۔

حافظ جی بیان کرتے ہیں جب وہ ہجرت کر کے آئے تھے اُن کے پاس کافی نقدی تھی لیکن یہاں آکر اُنہیں دوستی کے فریب دے کر یار لوگوں نے لُوٹ لیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ویسے حافظ جی پاکستان آکر خالی نہیں بیٹھے۔ اُنہوں نے یہاں مختلف قسم کے کاروبار کئے لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی۔ اللہ اپنے نیک بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ بس یُوں سمجھ لیجیئے کہ ابھی تک حافظ جی کی آزمائش ختم نہیں ہُوئی ـــــ سب سے پہلے اُنہوں نے عیدگاہ کے چوک پر چائے کا کھوکھا لگایا تھا۔ اُس کھوکھے کے سامنے پٹرول کا پمپ تھا اور بائیں طرف ساتھ ہی ٹرکوں کا اڈّہ تھا۔ دِن بھر ٹرکوں کے ڈرائیور اور کلینر حافظ جی کے کھوکھے

کے آگے پیچھے چائے پیتے نظر آتے تھے اور حافظ جی روزانہ سو پچاس روپے بلکہ کبھی اس سے زیادہ رقم کما کر گھر لے جاتے تھے۔

حافظ جی اُونچے اخلاق کے بُزرگ ہیں۔ ٹرک والوں میں ان کی چائے اور چرس کا چرچا ہوتا چلا گیا۔ حافظ جی کے یہ دن بہت بھلے تھے۔ اب بھی حافظ جی اپنے اس کاروبار کو جب یاد کرتے ہیں تو اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ اس روزگار کی بربادی یُوں ہُوئی کہ حافظ جی کی دکان پر پولیس والوں کا سایہ پڑ گیا۔ پہلے اِدھر اُدھر سے اکّادُکّا سپاہی گزرتا تو حافظ جی اپنا اثر بڑھانے کے لِئے اسے خوشامدانہ چائے کی پیالی کی پیشکش کر دیتے۔ رفتہ رفتہ پُولیس والوں کو ان کی چائے بہت پسند آنے لگی۔ ان کی دُکان پر ڈرائیوروں اور کلینروں کے علاوہ پولیس والوں کی ٹولیاں بھی دکھائی دینے لگیں ان میں سے اکثر مفت خورے شامل تھے۔ اور کچھ اُدھارے کر جانے لگے۔ کچھ اونے پونے دام جو حافظ جی کی لاگت بھی پُوری کرنے کے لِئے ناکافی تھے۔ دے کر چمپت ہو جاتے صِرف یہی نہیں بلکہ اِن سپاہیوں نے حافظ جی کے گاہک ڈرائیوروں اور کلینروں کی پڑتال بھی شروع کر دی۔

"تمہارے ٹرک میں آگ بجھانے والی بوتل نہیں ہے۔"

"تمہاری بریکیں ٹھیک نہیں ہیں۔"

"تمہارے کوپن کی تجدید نہیں ہُوئی۔"

پُولیس والوں کو مُفت کی چائے کے عِلاوہ ان ڈرائیوروں اور کلینروں کی جیبیں صاف کرنے کے لِئے حافظ جھکاؤ الدین کی دکان سے بہتر اور کوئی ٹھکانا نظر نہیں آتا تھا۔ رفتہ رفتہ شہر کے تمام تھانوں اور کوتوالیوں کی سپاہ شام کو یہاں جمع ہونے لگی اور حافظ جی کا کھوکھا پُولیس لائنز کی کینٹین بن گیا۔ جُوں جُوں پُولیس کی توجہ کھوکھے کی طرف زیادہ ہوتی گئی۔ حافظ جی کا کاروبار چوپٹ ہوتا چلا گیا۔ پُولیس کی موجُودگی میں کوئی ڈرائیور حافظ جی کے کھوکھے کی طرف مُنہ نہ کرتا۔ پُولیس کا ظُلم وستم اس قدر بڑھا کہ ایک دن ایک اُونٹ والا ٹرک پر

سردی سے ٹھٹھرتا ہُوا گُزرا۔ اس نے حافظ جی سے ایک پیالی چائے کی مانگی۔ کھوکھے کے اندر ایک سپاہی موجُود تھا۔ سارا دن پھر پھرا کر خالی ہاتھ گھر لَوٹنے کی بجائے سپاہی نے اس اُونٹ والے کو غنیمت جانا۔

"ابے تیرے اُونٹ کی بیک بتی کہاں ہے"۔

"اُونٹ کی بیک بتی"؟۔ دیہاتی نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"ہاں بیک بتی"۔ سپاہی نے تیور بدلتے ہُوئے کہا۔

"اُونٹ کے پیچھے اگر بتّی نہ ہو تو حادثے کا خطرہ ہوتا ہے"۔

ابھی دیہاتی حافظ جی کو چائے کے دام بھی نہ دینے پایا تھا کہ سپاہی نے اُسے تھانے کی طرف چلنے کی دعوت دی۔

حافظ جی جو پہلے ہی سے اپنے کاروبار کی تباہی کی وجہ سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ ضبط نہ کر سکے اور لگے سپاہی کو کھری کھری سُنانے۔ معاملہ طُول پکڑ گیا۔ اور حافظ جی مرنے مارنے پر تیّار ہو گئے۔ سپاہی موقع کی نزاکت دیکھ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد وہی سپاہی اپنے تین اور ساتھیوں کے ساتھ آ گیا۔ اُنھوں نے آتے ہی حافظ جی کے کھوکھے میں رکھے ہُوئے مٹّی کے گھڑے اور معمُولی چینی کے برتن جو کھوکھے کی ساری کائنات تھی توڑ دیئے۔ چھپّر سے بانس نکال لِئے اور حافظ جی کی مشکیں کس کر تھانے لے گئے۔ تھانے میں حافظ جی کے پلّے میں پانچ تولہ چرس باندھ کر ان کا چالان کر دیا۔ تھانے میں حافظ جی کی نیک چلنی کے کاغذات پہلے ہی موجُود تھے۔ اِن کاغذات کی روشنی میں اور پانچ تولہ چرس کی برآمدگی پر حافظ جی کو چھ ماہ کے لِئے گوشۂ عافیت میں بھیج دیا گیا۔

حافظ جی کی بیوی ہمسائے میں لوکل رئیس کے گھر میں خادمہ کے طور پر کام کرنے لگی اور حافظ جی کے دو نابالغ لڑکے جیب کتروں کے گروہ میں شامل ہو کر تربیّت حاصل کرنے لگے۔ جیل یاترا سے آ کر حافظ جی نے اپنے گھر کو مقفّل پایا۔ بیوی نواب صاحب کے ہاں خادمہ

تھی اور لڑکے خدا جانے کہاں تھے۔ حافظ جی نے ہمت نہ ہاری اور اُنہوں نے دُوسرا کاروبار شرُوع کیا۔ یار دوستوں سے دو ہزار رُوپیہ قرض لیا اور گھر کا تھوڑا بہت اثاثہ بیچ کر حافظ صاحب نے گوالوں سے ایک بھینس خریدی بھینس نہایت بھاری بھرکم جُثّے کی تھی۔ اور جب اُسے نہلا دُھلا کر اس کی پتلی کھال پر تیل مِلا گیا تو اُس کی سیاہی میں وہ چمک پیدا ہو گئی جو اکثر صاحب لوگوں کے سیاہ جُوتوں پر نظر آتی ہے۔ بھینس خریدنے سے پیشتر حافظ جی نے اُس کے دُودھ کا امتحان کر لیا تھا۔ گوالوں نے حافظ جی کے سامنے جب اُسے دوہا تو حافظ جی نے اپنی بالٹی میں ساڑھے آٹھ سیر دُودھ موجُود پایا۔ ظاہر ہے یہ دُودھ کی نہر حافظ جی کو بہت ارزاں معلُوم ہونے لگی۔ حافظ جی جب بھینس مع کٹیا کے اپنے ہاں لائے تو اہلیہ کی باچھیں کِھل گئیں۔

"اب میں ان کے ہاں نوکری کرنے نہیں جاؤں گی۔ مجُھ سے بیگم کی جلی کٹی باتیں نہیں سُنی جاتیں۔ سارا دن کام کر کے میری ہڈیاں ٹُوٹ جاتی ہیں اور بیگم صاحبہ ہیں کہ ان کے ماتھے کے بَل نہیں جاتے۔"

"دفع کرو اِس نوکری کو"۔ حافظ جی نے کہا۔ اس بھینس کی سیوا کرو۔ آٹھ سیر دُودھ میں سے دو سیر دُودھ گھر میں خرچ ہو گا اور بقیہ چھ سیر دُودھ ہمیں کم سے کم پچیس رُوپے روزانہ ضرور دے گا۔ یہ ہمارے گھر کے خرچ اور بھینس کے چارے کے لئے کافی ہیں۔

حافظ جی اور ان کی اہلیہ رات بھر خُوشی سے پھُولے نہیں سمائے۔ اُنہوں نے اسی رات کو بھینس کے لِئے سائیں مستان شاہ سے نظر کا تعویذ سوا رُوپے کی نیاز چڑھا کر حاصل کیا اور اسے ایک موٹے تاگے میں باندھ کر بھینس کے گلے میں ڈال دیا۔ رات بھر سبز چارہ بھینس کے آگے پڑا رہا۔ علی الصباح جب بسم اللہ کر کے حافظ جی نے اپنی دوہنی لیکر کٹیا کو کھولا تو گویا بھینس کی ماںتا بھی فنا ہو گئی۔ اس نے کٹیا کے وہ لاتیں ماریں کہ وُہ دوڑ کر دُور جا کھڑی ہُوئی بھینس نے زنجیر کی لمبائی کو نصف قطر متصوّر کر کے دائرے میں رقص کرنا شرُوع

کر دیا۔ حافظ جی ضبط نہ کر سکے اور انہوں نے بھینس کی پیٹھ پر لاٹھی کی پے در پے کئی ضربیں لگائیں۔ بھینس نے اپنا اگلا حصہ جُھکا کر پچھلی ٹانگیں اس انداز سے ہوا میں لہرائیں کہ حافظ جی اور ان کی بیگم ڈر کر صحن کی دیواروں سے جا لگے۔

"ابھی نہ مارو بھینس کو۔ نئی آئی ہے۔ آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گی۔" بیگم نے ڈرتے ہوئے کہا۔

حافظ جی نے غصّہ تھوک دیا اور بھینس کو پچکارتے ہوئے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے کے لئے بڑھے لیکن بھینس کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ شام سے پہلے حافظ جی انہی گوالوں کے پاس پہنچے اور اُن سے بھینس کی بے مروّتی کا شکوہ کرنے لگے۔

"بھینس تو کولھو کی مثال ہے حافظ جی! جتنا ڈالو گے اتنا نکالو گے۔ جسے تم چارہ کہتے ہو وہ کافی نہیں ہے۔"

حافظ جی کو اس دن معلوم ہوا کہ گوالے جب کسی بھینس کو بیچتے ہیں تو اُسے پہلے دو دن خوب کھلاتے پلاتے ہیں اور دودھ نہیں نکالتے۔ گوالے کے گھر میں بکتے وقت آٹھ سیر دودھ دینے والی بھینس گاہک کے گھر میں جا کر تین سیر سے بھی کم دودھ پلّے ڈالتی ہے۔ بہر حال یہ ستم صرف حافظ سے روا نہیں رکھا گیا تھا۔ جو بھی بھینس خریدے اس کے ساتھ یہی حشر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ بھی کہ حافظ جی کے پاس صبر کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔ وہی گوالا شام کو حافظ جی کی منّت سماجت پر ان کے گھر آیا اور حافظ جی کو تین سیر سے کچھ زیادہ دودھ نکال کر دے گیا۔ کیونکہ نئی جگہ ہے اس لئے اسے ایک تو آٹھ پہر کے بعد دوہنا پڑے گا اور چارے کی طرف اگر آپ کی توجہ رہی تو یہ دودھ بھی بڑھاتی چلی جائے گی۔ یہ کہہ کر گوالا رخصت ہو گیا حافظ جی گوالے اور بھینس کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہ گئے۔ اِدھر ان کی بیگم امید و بیم کے پھندے میں پھنس گئی۔ اگلے دن حافظ جی کو اطلاع ملی کہ ان کا بڑا لڑکا تھانے پہنچ چکا ہے اور پولیس اس کی مزاج پرسی کرنے میں مصروف ہے۔ حافظ جی بھینس کو بھول گئے اور تھانے

پہنچ گئے۔ معلوم ہُوا کہ کسی جیب کترے کو پُولیس نے ایک میلے میں جُرم کرتے ہُوئے پکڑا ہے۔ یہ صاحبزادے اُس کے ساتھ تھے اور اُسے موقع سے بھگا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"واہ جی واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ جس نے جیب کاٹی ہے آپ اسے پکڑیں۔ یہ بیچارہ تو تماشا دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ اِس کے پاس سے کوئی رقم برآمد ہُوئی؟ کوئی قینچی؟ کوئی بلیڈ؟ یہ کیوں مجرم ہے؟"

حافظ جی نے حوالدار صاحب سے کہا۔

حوالدار صاحب جو نئے نئے آئے تھے اور حافظ جی کی ہمسائیگی میں کرایہ پر مکان لیا تھا۔ حافظ جی سے کمال مہربانی سے گویا ہُوتے۔ "حافظ جی! آپ خفا نہ ہوں۔ میں بے انصافی نہیں کروں گا۔ آپ اسے ساتھ لے جائیں۔ ذرا اس پر نظر رکھیں۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ آپ میرے ہمسائے ہیں۔"

حافظ جی کی آنکھوں میں تشکّر کے آنسو آ گئے۔

"ہمسائے ماں جائے ہوتے ہیں۔" حافظ جی نے گھر میں آ کر اپنی بیگم سے کہا۔ بے چارہ نیک آدمی ہے حوالدار۔"

حوالدار صاحب کے گھر میں حافظ جی کی بیگم کا آنا جانا شرُوع ہو گیا اور حافظ جی کو اپنے لڑکے کی آمد پر اتنی خُوشی ہُوئی کہ وہ بھینس والے حادثے کو بھُول گئے۔ اِدھر بھینس نے ہر روز تین سیر دُودھ دینا قبُول کر لیا۔

دُودھ کے خریداروں میں حوالدار صاحب ہی رہ گئے تھے۔ ڈیڑھ سیر دُودھ روزانہ ان کے ہاں جانے لگا طے یہ ہُوا کہ حوالدار صاحب ہر مہینے تین رُوپے فی سیر کے حساب سے دُودھ کی رقم ادا کریں گے۔

حوالدار صاحب ڈیڑھ ماہ کے بعد معطّل ہو گئے اور مالک مکان کو کرایہ دیئے بغیر

رفو چکر ہو گئے۔ مالک مکان کرایہ کو پیٹ رہا تھا اور حافظ جی اپنے پانچ سو روپے کو۔
حافظ جی کا لڑکا پھر غائب ہو گیا۔ اب اس نے جیبیں صاف کرنے میں فن کارانہ صلاحیت حاصل کر لی تھی اور وہ دھندا کئے بغیر بیکار نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ چھوٹے برخوردار کا کوئی علم نہیں تھا کہ کہاں گیا۔ البتہ حافظ جی کی بیگم اس کی تصویر سامنے رکھ کر زار و قطار رویا کرتی تھی۔ اور حافظ جی چرس کے نشے میں دُھت سارے شہر میں مٹر گشت کر کے کافی رات کو گھر واپس لوٹتے

رفتہ رفتہ حافظ جی محلّے بھر کے مقروض ہو گئے۔ خصوصاً گھاس اور چارے والوں کے۔ ان کے صبر کے پیمانے لبریز ہو گئے اور اُنہوں نے رقم کی ادائیگی کا تقاضا الفاظ کی بجائے گالیوں کی صورت میں کرنا شروع کر دیا۔ حافظ جی جیسے باغیرت اور خاندانی آدمی یہ ذلت گوارا نہ کر سکے اور اُنہوں نے بھینس بیچ کر سب سے پہلے ان بدمعاشوں کا قرضہ ادا کیا۔ باقی قرض خواہوں سے یہ وعدہ کیا کہ حوالدار سے رقم وصول ہوتے ہی ادا کر دی جائے گی۔

یہ حافظ جی کا دُوسرا دھندا تھا جو یُوں بخیر و خُوبی اختتام پذیر ہُوا۔
حافظ جی کی بیگم پر لڑکوں کی آوارگی اور گھر کی مالی بدحالی کے صدمات بہت گراں گزرے۔ اُنہیں ہلکا ہلکا بُخار رہنے لگا۔ اور کھانسی کی شکایت بھی بڑھ گئی۔ جسم کمزور ہوتا چلا گیا۔ فاقہ کشی کے ایام میں موت کی فکر کسے رہتی ہے۔ حافظ جی نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اِنہی دنوں صدر ایّوب زندہ باد اور مادرِ ملّت زندہ باد کے نعرے فضاؤں میں گونجنا شروع ہو گئے۔ شہر میں سیاسی گہما گہمی بڑھ گئی۔ دونوں طرف سے سیاسی ورکر زسینوں پر بِلّے لگائے سڑکوں اور گلیوں میں گھُومنے لگے۔ اِن میں سے بہت سے حافظ جی کے واقف تھے اور دوست بھی۔ دوست اس طرح کہ حافظ جی کے ساتھ اکٹھے چرس پیتے تھے اور "ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت" پر ایمان رکھتے تھے۔ خُفیہ پناہ گاہوں میں اکٹھا بیٹھ کر چرس یا دُوسرا نشہ

کرنے والوں میں جو محبت اور رواداری آپس میں ہوتی ہے وہ حافظ جی کے بیان کے مطابق ان متقی اور پرہیزگاروں کی محبت میں نایاب ہے۔ حافظ جی جس مالی ابتلا میں محصور تھے اس کا تقاضا تھا کہ دوستوں کے اصرار پر کسی ایسے اُمیدوار کا دم چھلا بنیں جو صدر ایوب کا حامی و ناصر ہو کیونکہ دُوسری طرف کی حمایت میں مالی منفعت نظر نہیں آتی تھی۔ حافظ جی اپنے مخلص دوستوں کی مہربانی سے ایک بہت بڑے رئیس کی کوٹھی پر بلوائے گئے۔ اُنہوں نے ایک سال بعد وہی چکن کا کُرتہ پھر رفو کرا کے زیبِ تن فرمایا اور جیب میں "کے ٹو" کی ڈبیہ میں پانچ سگریٹ کچے اور پانچ پکے ڈال کر شہر کی ایک عظیم کوٹھی میں داخل ہوئے۔ یہ شہر کے اِس نواب کا مسکن تھا جو اپنے محبوب صدر کی حمایت میں الیکشن لڑ رہا تھا۔

حافظ جی کا احساس کمتری سے دم گھٹنے لگا لیکن وہاں اپنے ہم مشرب دوستوں کی موجودگی سے ہمت بڑھ گئی۔ اس پر نواب صاحب کا اخلاق سونے پر سہاگے کا کام کرنے لگا۔ اُنہوں نے حافظ جی کو اس گرمجوشی سے بغلگیر کیا کہ حافظ جی کی ناک گھاس جیسی خوشبو والے عطر سے بس گئی۔ حافظ جی کو خیال آیا کہ اگر ان کے پاس دولت ہوتی تو وہ اس کی بجائے حنا کا عطر خریدتے۔

"یہ کیسے احمق لوگ ہیں" حافظ جی نے دل میں سوچا۔

حافظ جی کو ایک صوفے پر بٹھایا گیا جس میں وُہ کمر تک دھنس گئے۔ نواب صاحب نے اپنا سگریٹ کیس کھول کر حافظ جی کو پیش کیا۔

"نہیں جناب مجھے "کے ٹو" کے سگریٹ ہی میں لطف آتا ہے۔ میں اپنا سگریٹ پیوں گا۔"

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنی ڈبیہ نکالی اور بدحواسی کے عالم میں سادہ سگریٹ کے بجائے پکا سگریٹ نکال کر مُنہ سے لگا لیا۔

"تو یہ برینڈ پیتے ہیں آپ"۔ نواب صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

حاضرین ہنس پڑے اور حافظ جی کے دل سے رہا سہا خوف بھی جاتا رہا۔

"آپ شوق سے یہ سگریٹ پیجئے۔ ہم سب بھائی بند ہیں۔ آپ یہ سگریٹ پیتے ہیں اور ہم کچھ اور۔ کون نہیں پیتا۔ اپنا گھر سمجھو حافظ جی۔

نواب صاحب نے حافظ جی کے کندھے کو پیار سے تھپتھپائے ہوئے کہا۔

حافظ جی کے دل میں نواب صاحب کی محبت اتر گئی۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہنے لگے۔

"نواب صاحب اگر میں حافظ ضیاء الدین کی اولاد سے ہوں تو نمک حرامی نہیں کروں گا۔ اب تو صرف جان ہی رہ گئی ہے وہ حاضر ہے۔ اگر حضور میرے پچھلے وطن جائیں تو لوگ میرے دادا کی باتیں اب بھی سنائیں گے آپ کو۔ کافر بھی محبت کرتے تھے حافظ جی سے۔"

"کیوں نہیں میں نے بھی تو آپ کو خاندانی آدمی سمجھ کر بلایا ہے۔ اگر آج آپ نہ آتے تو کل میں خود آپ کے پاس آتا" — یہ کہہ کر نواب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور حافظ جی کو ایک طرف لیجا کر سو روپے کا نوٹ تھما دیا۔ ساتھ ہی ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ حافظ جی کو گھر کے قریب ترین مقام پر چھوڑ آئے۔

حافظ جی کے ویرانے میں پھر بہار آگئی۔ اُنہوں نے دونوں وقت کھانا نواب صاحب کی کوٹھی پر کھانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی بیگم کا کھانا بھی وہیں سے آنے لگا۔ اور اس کے علاوہ دس روپیہ کا نوٹ بھی۔

حافظ جی کی مصروفیات بڑھ گئیں اور بڑے آدمیوں سے صاحب سلامت کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہ نواب صاحب کے ہمراہ اکثر کار میں بیٹھے نظر آنے لگے۔ جلسے جلوس میں اُن کی شرکت لازمی قرار پانے لگی۔ اُنہوں نے ہر ہفتے حجامت بھی بنوانا شروع کر دی اور مونچھوں پر سرخ مہندی کے رچاؤ سے اُن کی جوانی پھر اُبھرنے لگی۔ نواب صاحب نے اُنہیں چکن کا ایک اور کرتہ بھی تیار کروا دیا۔ ہوائی چپل کی بجائے بہاول پوری کا مدار

جوتی ان کی قدم بوسی پر مامور ہوگئی اپنے جلسوں کی حفاظت اور پہرہ داری اور فریق مخالف کے جلسوں میں دنگا فساد کرانا ان کے اولین فرائض میں شامل تھا۔ کئی دفعہ سر پھٹول تک نوبت آئی۔ پولیس والے تھانے پکڑ کرے گئے لیکن حافظ جی کا بخت رسا عین شباب پر تھا۔ اس لئے حافظ جی سے باز پرسی کی بجائے۔ کوکا کولا اور سگریٹ سے خاطر کی جاتی اور کرسی پیش کی جاتی۔ حافظ جی کے یہ چند روز بہت اچھے تھے۔ حافظ جی گلی کوچوں میں تقریریں کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔

"صاحبو! اسلام عورت کی شاہی نہیں مانتا۔ عورت مسلمان ملک کی بادشاہ نہیں ہوسکتی۔ بے غیرتو! ماؤں بہنوں کو گھروں میں بٹھایا جاتا ہے"۔

"اللہ نے حکومت کی کرسی مرد کے لئے بنائی ہے"۔

جیسے جیسے الیکشن قریب آتا گیا۔ حافظ کی اہمیت بڑھتی چلی گئی۔

اگر نواب صاحب کامیاب ہو گئے تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ وہ اپنی بیمار اہلیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہنے لگے۔

"اب ہمارے لڑکے بھی آجائیں گے"۔

جب حکومت ہی ہماری ہو جائے گی تو ان کا کھوج نکالنا کیوں کر مشکل رہے گا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے حافظ جی کی آسودگی کے دن بھی کٹتے چلے گئے۔ آخر کار الیکشن کا دن آیا۔ شریفوں اور خاندانی آدمیوں نے نواب صاحب کی پوری حمایت کی متعلقہ افسران نے بھی دیانت داری سے اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی۔ نواب صاحب الیکشن جیت گئے۔ ہر طرف پاکستان زندہ باد۔ صدر ایوب زندہ باد۔ نواب صاحب زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ نواب صاحب کے گلے میں پھولوں کے انبار تھے اور انہیں حافظ جی اپنے کاندھوں پر اٹھا کر پولنگ اسٹیشن سے کار تک لے آئے۔ حافظ جی اس معرکہ کے سر ہوتے ہی گھر واپس آگئے اور دوسرے دن نواب صاحب کی ملاقات کے لئے علی الصبح ان کے

مسکن پر گئے۔ نواب صاحب کے دولت کدے پر بہت بھیڑ تھی۔ وہ ہر آدمی سے مُسکرا کر
مل رہے تھے لیکن مصافحے کے فوراً ہی بعد ہاتھ کھینچ لیتے۔ پھر دُوسرے سے اور تیسرے
سے ہاتھ ملاتے رہے۔ یہ رسمی دُعا و سلام ہو لینے کے بعد نواب صاحب درونِ خانہ تشریف
لے گئے اور حافظ جی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مُنہ لٹکائے اپنے گھر واپس آ گئے۔ اس
کے بعد حافظ جی دو دفعہ نواب صاحب کے گھر گئے لیکن اُنہیں اذنِ باریابی نصیب نہ ہُوا
آخر کار وُہ اُمّیدیں منقطع کر کے گھر بیٹھ گئے اور یوں حافظ جی کا یہ تیسرا کاروبار بھی باحسرت و یاس
ختم ہو گیا۔ اب حافظ جی کے سامنے پھر وہی بربادی نظر آنے لگی۔ بیوی نے چھ ماہ کی
طویل علالت کے بعد کسمپرسی کے عالم میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ حافظ جی کا بڑا لڑکا جیب
کترنے کے جُرم میں تین سال کی سزا پا گیا۔ چھوٹے لڑکے کے متعلّق کوئی اِطلاع نہیں ملی کہ وُہ
کہاں ہے۔

اب حافظ جی سارا دن بازار کے تخت پوشوں پر نشے میں دُھت بیٹھے نظر آتے ہیں۔
وہ چرس کے اڈّوں کے محافظ ہیں۔ جہاں اُنہیں دو وقت کا کھانا اور چرس مِل جاتی ہے۔
حافظ جی کی لوگ بڑی عزّت کرتے ہیں کیُونکہ وہ ایک نیکدل اور وضع دار بُزرگ ہیں۔
خُدا جانے اس مُلک کی دھرتی پر حافظ جھکاؤ الدّین جیسے اور کتنے لوگ زندگی کے
دن پُورے کر رہے ہیں۔

صُوفی نجم الدّین جفّار

یہ تقریباً پچاس سال پُرانا قصّہ ہے۔ اب تو وُہ لوگ مر چکے ہیں جنہوں نے صُوفی صاحب مرحُوم کی زیارت کی تھی۔ اور جو باقی ہیں وہ بھی میری طرح پا بہ رکاب بیٹھے ہیں۔ ہم سب کے مَر جانے کے بعد صُوفی صاحب کی صحیح معنوں میں وفات ہو گی کیونکہ اُن کا ذکر کرنے والا بھی باقی نہیں رہے گا۔ اور اس طرح دُنیا ایک عظیم الشّان اِنسان کی یادوں تک سے بھی محروم ہو جائے گی۔

صُوفی صاحب خُود بے اولاد تھے لیکن دُوسروں کے بچّوں پر اپنی اولاد کی طرح شفقت فرماتے تھے۔ نہایت نیک اور عالم فاضل بُزرگ تھے۔ صُوفیائے کرام کے زُمرے میں ان کی بے حد تکریم کی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے سینے میں عشقِ الٰہی سے معمُور اور منوّر دل رکھتے تھے۔ محفلِ سماع میں جب اُن پر وجد کا عالم طاری ہوتا تھا تو گاؤں کے بچّے مسجد کے صحن کی چھوٹی چھوٹی دیواروں کے ساتھ لگ کر کھڑے گھنٹوں اس رُوح افزا منظر سے لُطف اندوز ہوتے تھے۔

صُوفی صاحب نامی گرامی جفّار تھے اور ان کے علم کا شہرہ دُور دراز تک پہنچ چُکا تھا۔ اپنے گاؤں کے عِلاوہ جو مُلتان شہر سے شمال میں چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اُس علاقے سے مریدان

باصفا اِن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہوتی تھی۔ وُہ اُنہیں مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ کر دیتے تھے اور آفات زمانہ سے محفوظ رکھنے کے لِئے گنڈے تعویذ بخشتے تھے۔ طرح طرح کی مصیبتوں کے مارے ہوئے لوگ اِن سے فیض حاصل کر کے واپس چلے جاتے جس کے بدلے خدمتِ عالیہ میں قیمتی تحائف اور نقدی پیش کی جاتی۔ صُوفی صاحب کی عمر اُن دنوں میں بہتر سال کی تھی لیکن وُہ اس کے باوجُود نہایت خُوش پوش اور باذاق اِنسان تھے۔ وُہ اپنی کثیر آمدنی سے جو کچھ ان کے ذاتی اخراجات سے بچتا، مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ اس وجہ سے غریب پرور مشہور تھے۔ ان کی وضع قطع اور لباس میں قدامت کی شان و شوکت تھی۔ سر پر ململ کے پُورے تھان کی دستار گلے میں قمیص کے عِلاوہ چکن کا انگرکھا اور بھاری بھرکم شلوار کے نیچے تلّے کا کامدار کھُسہ ان کے معمُول کا لباس تھا۔ ان کی ٹھوڑی کے عین وسط میں ڈاڑھی کی مانگ تھی جو اسے دو مساوی حصّوں میں اس صُورت سے تقسیم کرتی تھی جیسے ایک ایک بال گن کر نکالی گئی ہے۔ ہر روز ملکہ ہر وقت کے شانے نے اس باوقار ریش کے دونوں حصّوں کو کھُلی ہُوئی مقراض کے پروں کی طرح ایک دُوسرے سے الگ کر رکھا تھا۔ مجال ہے جو ایک طرف کا بال دُوسرے حصّے کا رُخ کر سکے۔ ان کی نیم باز آنکھوں میں کاجل کی دھاریں سُنہری فریم والی عینک کے بیضوی شیشوں میں چمکتی رہتی تھیں اور مُنہ میں پان کی گلوری اُن کے حُسن و جمال میں دائمی اضافے کا باعث بنتی۔

صُوفی صاحب اپنی علاقائی زبان کے قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اور وُہ اپنے پیشے کی مناسبت سے حقّار تخلص کرتے تھے۔ وہ مجمع میں اپنی کافیاں اور دوہڑے ترنّم سے پڑھتے تھے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز اور عشقِ الٰہی کا وہ عرفان مضمر ہوتا کہ سُننے والوں پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا۔ اپنا کلام سندھڑی کی راگنی میں گا کر پڑھتے اور اکثر روتے روتے ان کی گھگھی بندھ جاتی۔ میری اُن سے پہلی مُلاقات ایک علاقائی زبان کے مُشاعرے میں ہُوئی۔ میں مُلتان کالج میں بارھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے کلام سے اس قدر متاثر ہُوا کہ میرا

شمار بھی ان کے خصوصی مداحوں میں ہونے لگا۔ وہ جب بھی شہر میں تشریف لاتے میرے غریب خانے پر ضرور قدم رنجہ فرماتے انہی ملاقاتوں میں مجھے اُنہیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہُوا انہی کے فیضانِ نظر سے مجھے فارسی اور سرائیکی ادب سے مستفیض ہونے کا موقعہ بھی ملا۔

صُوفی صاحب کے کچھ نیاز مند عبدالحکیم کے قصبے کے قریب ایک چک میں رہتے تھے۔ یہ لوگ اُنہیں اپنے پاس اکثر لے جاتے تھے۔ صُوفی صاحب اپنے گاؤں سے مُلتان کرائے کے تانگے پر آتے۔ ایک رات میرے ہاں بسر کر کے صُبح سویرے عبدالحکیم چلے جاتے جہاں سے ان کے عقیدت مند اُنہیں گھوڑے پر سوار کر کے اپنے گاؤں لیجاتے۔ اس سفر میں اُن کا ایک وفادار مُلازم ان کا بیگ اور کتابوں کی گٹھڑی اُٹھائے ہُوئے ان کے ہمراہ رہتا تھا۔ یہ مُلازم ان کا تنخواہ دار مُلازم ہونے کے علاوہ اُن کے علم و فضل اور کشف و کرامات کا اس قدر گرویدہ تھا کہ ہر وقت انہی کے فضائل بیان کرتا رہتا تھا۔ عقیدتمندوں میں اس کا بھی بہت بڑا مقام تھا۔ رفتہ رفتہ صُوفی صاحب کا عبدالحکیم کی طرف آنا جانا زیادہ ہوتا چلا گیا۔ وہ تقریباً ہفتے میں تین دن وہاں بسر کرنے لگے۔ آتے جاتے راستے میں میرے پاس بھی اُن کی تشریف آوری ضروری تھی۔ اس طرح مجھ پر بھی اُن کے الطاف و کرم کا اضافہ ہوتا چلا گیا میری پُرخلوص نیازمندی کی وجہ سے قبلہ صُوفی صاحب اپنے ذاتی معاملات میرے سامنے تفصیلاً بیان کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر اوقات عشق و معرفت کے فلسفے بیان فرماتے۔

"عشق حسن کامل کا جزو ہے۔ حُسن عشق کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے خود بیتاب ہے۔ تمام ارواح حُسن ازل کی کرنیں ہیں۔ اصل میں حُسن کامل صرف اسی کی ذات ہے باقی سب اُس کی شعاعیں ہیں۔ شعاعیں واپس اپنے مبدا کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔ جسم کے لئے فنا ہے رُوح کے لئے نہیں"۔ ان فلسفوں کے ابلاغ میں وُہ بعض دفعہ ایسی پیچیدگیوں میں چلے جاتے کہ میری عقل اُن کے استدلال کو سمجھنے سے قاصر رہتی اور میں حیرت

سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔ ایک دِن مجھے اسی طرح درس دیتے ہوئے اُنہوں نے انتہائی دلچسپ امر کا انکشاف کیا اور فرمانے لگے۔

"جانتے ہو کہ میں عبدالحکیم کے چک میں کیوں جاتا ہوں"۔

جی نہیں! میں نے عرض کی۔

"وہاں مجھے حُسنِ ازل بے حجاب نظر آتا ہے"۔

"حُسنِ ازل؟۔ بے حجاب؟۔ میں نہیں سمجھ سکا"۔

"مجھے حُسنِ ازل ایک معصوم چہرے میں نظر آگیا ہے۔ میں اُس کی پرستش کرنے جاتا ہوں"۔

میں نے صُوفی صاحب کے چہرے کو حیرت سے دیکھا اور استعجاب سے پُوچھا۔

"آپ کو کس چہرے میں حسنِ ازل نظر آگیا ہے"؟

"ایک معصوم لڑکی کی شکل میں"۔

"معصوم لڑکی؟ کون ہے وہ۔؟"

"تُم جانتے ہو اُس کو۔ اُس کا نام مریم ہے اور اُس کے چہرے میں اللہ کا جلوہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے"۔

میں کانپ گیا۔ مریم کے مقدّس نام والی لڑکی صُوفی صاحب کی توجّہ کا مرکز بن رہی تھی؟۔

"اُس کی کیا عُمر ہے؟"۔

"یہی کُچھ تیرہ چودہ سال کی ہو گی"۔ "تُم بیوقُوف ہو۔ عمر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمام ارواح ایک ہی وقت میں تخلیق ہُوئی ہیں۔ یہ مادی جسم ایک لباس سے زیادہ حیثیّت نہیں رکھتا۔ جسم کے مقدّر میں موت ہے اور اس کی زندگی کو دنوں۔ مہینوں اور سالوں سے ماپا جا سکتا ہے لیکن رُوح کو کوئی فنا نہیں ہے۔ رُوحیں سب ہم عمر ہیں اور غیر فانی ہیں۔ رُوحیں جب ایک دُوسرے کو کشش کرتی ہیں تو عُمر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

"لیکن صُوفی صاحب وہ تیرہ چودہ سال کی معصوم لڑکی اور آپ بہتّر سال سے تجاوز فرما چکے ہیں۔ آپ کا اور اُس کا کیا جوڑ۔ آپ ان خیالات کو جانے دیں۔

"خیالات سماوی ہیں۔ یہ نہ لائے جا سکتے ہیں اور نہ چھوڑے جا سکتے ہیں۔"

صُوفی صاحب برہم ہونے لگے اور میں نے احتیاطاً موضوع بدل دیا۔ لیکن دل ہی دل میں حیران تھا کہ اس عمر میں ان کا ذوقِ نظر خدا جانے کیا گل کھلائے گا۔

صُوفی صاحب عبدالحکیم تشریف لے گئے۔ پھر واپس آئے۔ پھر ایسے گئے کہ واپس نہیں آئے۔ کریم بازار میں مِلا تو معلوم ہُوا کہ صُوفی صاحب عبدالحکیم میں مستقل رہائش اختیار کر چکے ہیں اور گرد و نواح کے زمینداروں کے طفیل صُوفی صاحب کے گوشۂ عافیت میں ہُن برس رہا ہے۔ میں صُوفی صاحب کی آسُودگی سے مسرور ہُوا اور کریم کے ہاتھ شوقِ مُلاقات کا پیغام بھیجا لیکن صُوفی صاحب نے مُلتان کا چھ ماہ تک رُخ نہ کیا۔

ایک دن سخت گرمی کے موسم میں ان کا مُلازم میرے نام گرامی نامہ لیکر آیا جس میں اُنہوں نے اہالیان چک کی مہمان نوازی اور عزّت افزائی کو سراہا اور مجھے ایک علاقائی زبان کے مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ مُلتان سے چند اور شعرا کو بھی ساتھ لے آؤں۔

کالج میں چھٹیاں تھیں۔ جس روز وہاں مشاعرہ ہونا تھا اسی دن علی الصبح ان کے مداحین میں سے چند شعراء کو لیکر عبدالحکیم پہنچ گیا۔ وہاں جا کر ہم نے صُوفی صاحب کی بڑی عزت و تکریم دیکھی۔ صُوفی صاحب نے ہمارا استقبال گاؤں کے باہر کیا۔ گاؤں کے زمیندار اور کاشت کار اُن کے ہمراہ تھے۔ ان سب لوگوں نے ہمیں نمبردار کے ڈیرے میں ضیافت دی۔ صُوفی صاحب کے چاروں طرف ان کے مُریدانِ باصفا کا جمگھٹا تھا اور ہمیں مُرغیوں کے سالن اور شربتِ فولاد سے نوازا گیا۔ اس کے بعد ہم لوگ مشاعرے میں جا پہنچے۔ وہاں چک کے نمبردار نے صُوفی صاحب کے کشف و کرامات سے حاضرینِ محفل کو متعارف کرایا اور صُوفی صاحب کے ورودِ مسعود کو بہترین

حسنِ خطابت سے بیان کیا۔ صوفی صاحب متفقہ تائید حاصل کر کے کرسیِ صدارت پر براجمان ہو گئے۔ کچھ سامعین تو زمین کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ چارپائیوں پر رونق افروز تھے۔ ملتان کے دو شاعروں کا کلام بہت پسند کیا گیا اور انہیں بار بار کافیاں اور دوہڑے سنانا پڑے۔ آخر میں صوفی صاحب نے خطبۂ صدارت کے دوران تبرکاً چند اشعار سنائے۔ جو سامعین پر بجلی کی طرح ٹوٹے۔ صوفی صاحب کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور ان کی آواز بھرا گئی۔ اِدھر مجمع پر رقت کا عالم طاری ہو گیا۔ اور لوگ ایک دوسرے سے گلے لگ کر رونے لگے۔ چند ایک نے فرطِ عقیدت سے بے قابو ہو کر صوفی صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔ اور ان کے پاؤں پر ماتھا رگڑنا شروع کر دیا۔ اس کے تو ہم پہلے ہی قائل تھے کہ صوفی صاحب کے کلام میں شدت کا تاثر تھا لیکن عقیدت کے اظہار کا یہ بھونڈا منظر برداشت سے باہر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے مشاعرے کا اختتام ہوا اور اس محشرِ آہ و فغاں سے نجات ملی۔ شام کے وقت مرغن غذا سے ہماری پھر تواضع کی گئی اور ٹھنڈے دودھ میں شربتِ فولاد ملا کر پلایا گیا۔ ہمارے رخصت ہونے سے قبل صوفی صاحب نے تخلیئے میں رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"تم نے کہیں مریم کو دیکھا؟" وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔

"نہیں جناب۔ میں نے تو کسی عورت کو نہیں دیکھا۔"

"وہ ضرور آئی ہو گی۔ وہ بڑی شریر لڑکی ہے اور صاحبِ درد بھی۔ وہ کہیں چھپ کر میرا کلام ضرور سن رہی ہو گی۔ خیر تمہارا اس سے کیا مطلب؟۔ تم اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔"

"نہیں جناب! مجھے کیا پڑی ہے۔ اور میں تو ابھی واپس جا رہا ہوں۔ میراں چک والوں سے کیا واسطہ۔"

"ہاں بھئی۔ یہ لوگ بڑے جاہل ہیں۔ محبت کی پاکیزگی کو پہچانتے ہی نہیں۔ تم سے ایک راز کی بات کہوں۔؟۔ میں نے اس لڑکی کے ماتھے پر فرشتوں کی صبح کا اجالا دیکھا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں حوروں کے بسیرے دیکھے ہیں۔"

میں کانپ گیا۔ صوفی صاحب کے حُسنِ ابلاغ کی ہم آہنگی کے ساتھ ان کی ڈاڑھی کے دونوں پھل مربُوط انداز میں حرکت کر رہے تھے جیسے طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہو۔ صُوفی صاحب سے رخصت ہونے کے بعد ہم تین گھنٹے کے بعد ملتان پہنچ گئے۔ میں راستے بھر صُوفی صاحب کی حماقت اور ناعاقبت اندیشی پر مُسکراتا بھی رہا اور بہت افسوس بھی ہُوا مشاعرے کے بعد صُوفی صاحب کا گُذر مُلتان کی طرف نہ ہُوا۔ وہ چک میں اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ عزّت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کے ذوقِ نظر کا سامان بھی موجُود تھا۔ رفتہ رفتہ میری بھی ان سے مِلنے کی آرزُو منقطع ہو گی۔ اس واقع سے تقریباً چھ ماہ بعد ایک دن علی الصباح کریم نے میرے دروازے کے کواڑ کوٹنا شروع کر دیئے۔ مَیں نے دروازہ کھولا تو اُسے سخت پریشانی کے عالم میں دیکھا۔

"ارے کریم خیر تو ہے۔ یہ صُبح صُبح کس طرح آ گئے"؟

"کیا پُوچھتے ہو صاحب۔ بڑی مصیبت آ گئی ہم پر"

کریم نے ہانپتے ہُوئے کہا۔

"آپ ذرا بیٹھیں تو عرض کروں"۔

"ارے ہُوا کیا کچھ بتاؤ تو سہی"؟

"اجی ہُوا کیا ہے؟ صُوفی صاحب پر ایک لڑکی کا جھُوٹا اِلزام لگا کر گاؤں کے چند بدمعاشوں نے اُنہیں نمبردار کی بیٹھک پر بٹھا رکھا ہے۔ خُدا کا قہر ٹُوٹے گا اس گاؤں والوں پر جس میں ایسے لوگوں کے ساتھ یہ سلُوک ہو رہا ہے"۔

مَیں اس انجام سے پہلے ہی باخبر تھا۔ اس لِئے مجُھے چنداں تعجب نہ ہُوا۔ لیکن صُوفی صاحب کی عقیدت سے مجبُور ہو کر کریم کے ساتھ بس میں سوار ہو کر عبدالحکیم روانہ ہو گیا۔ ڈھائی گھنٹے کی مُسافت کے بعد چک میں داخل ہُوا جس میں آج سے چھ ماہ قبل ہمارا پُرجوش استقبال ہُوا تھا۔ میں سراسیمگی کے عالم میں نمبردار کے ڈیرے کی طرف روانہ ہُوا۔ جب نمبردار کے ڈیرے میں داخل ہُوا تو میں نے وُہ منظر دیکھا جو ناقابلِ بیان ہے۔ صُوفی صاحب چارپائی کے ایک

پائے کے ساتھ بندھے ہوئے مسندِ خاک پر پڑے ہوئے تھے۔ چہرہ دستیوں کی وجہ سے آپ کا لباس دریدہ ہو چکا تھا۔ اُن کے حنا آلودہ بال ماتھے کے زخم کے خُون سے تر تھے۔ عینک کا تو ذکر ہی کیا۔ دونوں آنکھوں کے نیچے گاؤں والوں کے تشدّد کے نیل گوں حلقے دکھائی دے رہے تھے۔ ریشِ محترم خُون اور غُبار میں اٹی ہُوئی تھی۔ مُجھے دیکھتے ہی دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ میری آنکھیں بھی اس المناک منظر کی تاب نہ لا کر نم ہو گئیں لیکن مَیں نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہُوئے صُوفی صاحب کی طرف توجہ دینے کی بجائے اس فرعونِ دیہات کو سلام کیا جو نمبردار ہونے کی حیثیّت سے کرتا دھرتا تھا۔ میری عاجزی و انکساری نے نمبردار کو متاثّر کیا اور اُس نے میری اُسی طرح تعظیم کی جس طرح پہلے کی تھی۔ میرے لئے وُہ کُرسی منگوائی جو صُوفی صاحب کو مشاعرے کی صدارت کے لِئے پیش کی گئی تھی۔ مَیں اس کُرسی کے آغاز و انجام کے تفاوت کو سوچ کر لرز گیا۔ لیکن نمبردار کے حُکم کی تعمیل میں چُپ چاپ بیٹھ گیا۔ پیشتر اس کے کہ میں کُچھ بات کرتا نمبردار نے خُود سلسلۂ کلام شرُوع کیا۔

"دیکھئے صاحب! مَیں اچھی طرح جانتا ہُوں کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں۔ آپ کو علم نہیں کہ یہ صُوفی کتنا خطرناک اور بدمعاش ہے۔ اس پاپی نے ہمارے گاؤں کی غیرت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ ایسا کمینہ ہے کہ اس لڑکی کی عصمت لُوٹنے کے لئے تیار ہو گیا جو اسے بُرا ابّا کہتی ہے۔ یہ نامُراد اسے اپنی بیٹی کہتا رہا اور آخر میں اس سے کیا سلُوک کیا؟ یہ خود موجُود ہے اس سے آپ خُود پُوچھ لیں۔"

میرا سر ندامت سے جُھک گیا۔ مَیں نے نیچی نظروں سے نمبردار کے سامنے ہاتھ جوڑے اور نمبردار کا غصّہ بھی کُچھ ٹھنڈا ہُو گیا۔

"لڑکی کی چیخ و پکار پر ہمسایوں نے اُس کی عزّت بچائی ورنہ یہ وحشی درندہ ... خُدا غارت کرے اس بے ایمان کو۔ بڑا عالم و فاضل صُوفی بنا پھرتا ہے۔"

مَیں نے مصلحتاً صُوفی صاحب سے گستاخیاں شرُوع کر دیں تاکہ نمبردار کی برہمی کم ہو۔

میں نے نمبردار کو اُس کے گاؤں اور خاندان کی عزّت کا واسطہ دے دیا۔ اور معاملے کو رفع دفع کرنے کی التجا کی۔ میری یہ التجا اس شرط پر منظور کی گئی کہ صُوفی صاحب ایک گھنٹے کے اندر گاؤں سے نکل جائیں گے۔ اگر نہ گئے تو اُن کے خلاف تھانے میں پرچہ درج کر دیا جائے گا۔

میں نے اور کریم نے اُن کا سارا سامان جس میں اُن کی کتابیں اور پان دان۔ بستر۔ غالیچہ۔ کرسیاں اور میز تھی ایک چھکڑے پر لادا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی سرمایہ دار کی دُلہن کا جہیز جا رہا ہے۔ عین اُسی وقت صُوفی نے کریم سے جھنجھلا کر کہا۔

"دیکھو یہ درس کی کتابیں ہیں جو قابلِ تعظیم ہیں۔ انہیں عزّت سے تانگے میں رکھو۔"
گاؤں کے لوگ ہماری کسمپرسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ لیکن ہمارے ساتھ کسی کو ہمدردی نہیں تھی۔
کسی منچلے نے آوازہ کستے ہوئے کہا۔

صُوفی جی! کتابوں کی تو اتنی عزّت کرتے ہو لیکن غریبوں کی بہو بیٹیوں کی کوئی عزّت نہیں سمجھتے۔ لعنت ہے۔ آپ کے علم پر"
صُوفی صاحب مُلتان سے ہو کر اپنے دیہات چلے گئے اور کچھ عرصے کے بعد اُن کی وفات کی اطلاع ملی۔ اور یُوں وہ اپنا فلسفہ بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔

راجاں

قبروں میں مُردے دفن ہوتے تو دیکھے ہیں لیکن مُردے قبر سے نکلتے کم ملاحظہ کیئے ہوں گے۔ اسی وجہ سے پیر غازی کے گورستان میں جو ایک گاؤں سے ملحق ہے آج خاصی رونق رہی۔

سرکاری افسروں میں چوکیدار سے لیکر علاقہ کے مجسٹریٹ تک مختلف مناصب پر فائز خاکی وردیوں میں نگہداران امن کے علاوہ ڈاکٹر کمپاؤنڈر۔ چپراسی۔ موٹریں۔ خیمے۔ کُرسیاں۔ چارپائیاں۔ بستر۔ مشروبات۔ میوے۔ مٹھائیاں اور ہر قسم کی آسودگی کا سامان موجُود تھا۔ ایسا معلُوم ہو رہا تھا جیسے گورستان پر اللہ پاک کی خاص رحمتوں کا نزول ہو رہا ہے۔

اس سارے ہنگامے کا مقصد راجاں کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کے شکم کے مواد کو سربہ مہر کرنا تھا۔ اور دیکھنا یہ تھا کہ راجاں کی موت عام حالت میں ہوئی ہے یا اسے زہر دیا گیا ہے۔

انصاف سے متعلق تمام محکموں کے افسر اپنا اپنا فرض انجام دے رہے تھے۔ مجسٹریٹ نے متعلقین کے بیان قلم بند کر کے اس امر کی تسلّی کر لی کہ جو قبر کھودی جا رہی ہے وہ راجاں ہی کی ہے اس تسلّی کے بعد راجاں کے جسد خاکی کو چار دن مدفون رہنے کے بعد واپس

نکالنے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے گورستان میں ایک درخت کے سائے کے نیچے ایک میز رکھوا کر اس کے چاروں طرف قنات کا پردہ سا بنوا لیا تھا۔ میز پر راجاں کی لاش رکھ کر اسے ان اوزاروں سے قطع و برید کرنے کا انتظام ہو رہا تھا جو قنات کے باہر تیل کے چولھے میں اُبل رہے تھے۔ مجمع میں ایک طرف راجاں کا باپ ہتھکڑی میں بندھا ہوا پولیس کی حراست میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے اُس کی پریشاں حال بیوی ٹکٹکی باندھے اس قبر کو دیکھ رہی تھی۔ جس سے اس کی بیٹی کی لاش برآمد ہونا تھی۔ راجاں اس کی اکلوتی لڑکی تھی جسے اس نے اٹھارہ سال بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ ماں کی آنکھوں کے سامنے وقت پیچھے کی طرف لوٹ گیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ راجاں انتہائی معصومیت کے انداز میں گاؤں کے مدرسے کی طرف کتابیں اُٹھائے جا رہی ہے۔ وہ گاؤں کی تمام لڑکیوں سے زیادہ خوش شکل اور باحیا ہے۔ وُہ آٹھویں جماعت میں اپنے مدرسے میں اول آئی ہے اُستانیاں اس کے گھر میں مبارک باد دینے آئی ہوئی ہیں۔

گاؤں کے تمام لوگ اپنے لڑکوں سے راجاں کا رشتہ لیکر آتے۔ لیکن راجاں کے ماں باپ نے گاؤں کے جاہل زمینداروں کے آوارہ بیٹوں میں کسی کو رشتے کا اہل نہیں سمجھا۔ والدین کی تمام اُمیدیں اپنی بچّی سے وابستہ تھیں اُن کی خواہش تھی کہ راجاں پڑھ لکھ کر ایک ڈاکٹر بنے اور اس کا نام روشن ہو۔ یہی وجہ تھی کہ راجاں کے باپ نے اپنے تمام عزیز زمینداروں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب تک راجاں ڈاکٹری پاس نہیں کر لیتی رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مڈل کر لینے کے بعد راجاں شہر کے زنانہ ہائی اسکول میں داخل ہوئی جہاں سے وُہ ہر ہفتے اپنے والدین کے پاس چھٹی کے دن ملنے آتی اور اس کی رشتہ دار عورتیں ہمسائیاں اور بچپن کی سہیلیاں اس کے گھر ملنے آجاتیں۔ راجاں کے والدین اپنی اکلوتی بیٹی کو زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوتے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ راجاں ابھی ہائی اسکول کا آخری امتحان بھی

پاس نہ کرنے پائی کہ گاؤں کے نمبردار کے بڑے لڑکے کی توجّہ اس کی طرف ہو گئی۔ نمبردار نے اپنے لڑکے کا رجحان دیکھا اور راجاں کے رشتے کی بات کر دی لیکن راجاں کے باپ نے اِنکار کر دیا اور یہی اِنکار اُس کے گھر کی تباہی کا آغاز بنا۔ راجاں کا باپ جانتا تھا کہ نمبردار کا بدکردار اور اَن پڑھ لڑکا کسی طرح راجاں کے لِئے موزوں نہیں ہے۔ اِس انکار سے نمبردار کے وقار کو ٹھیس لگی۔ اِس نے اپنے چند معتبرین کو بھیج کر اس کے باپ کو مجبور کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ وہ یہ دیکھ کر بپھر گیا اور انتقام پر اُتر آیا۔

وُہ کیا قیامت کی شام تھی جب راجاں کو چند بدمعاشوں نے تانگے سے اُٹھا لیا اور تانگے والے کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ آیا بھی ڈر کی وجہ سے خاموش بیٹھی رہی۔ وُہ راجاں کو اُٹھا کر رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ آیا کی اِطلاع پر راجاں کے ماں باپ روتے پیٹتے جائے واردات پر پہنچے۔ وہاں جا کر ساری حقیقت کا علم ہُوا۔ وہ مجبوراً نمبردار کے گھر گئے اور نمبردار کی بڑی منّت سماجت کی کہ وُہ اس کی لڑکی کو واپس کر دے۔ لیکن نمبردار نے واقعہ سے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ آخرکار وُہ تھانیدار کے پاس گئے اور رپورٹ درج کروائی۔ اُس نے رپورٹ تو درج کر لی لیکن اِس حقیقت سے انکار کر دیا کہ اِس اغوا میں نمبردار کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ وُہ نمبردار کا نمک خوار تھا۔

راجاں کے ماں باپ کو زمین و آسماں گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ بسیار کوشش کے بعد بھی راجاں کی کھوج میں ناکام ہو گئے اور یوں اُن کی معصوم اور پاکباز لڑکی ہوس کا شکار ہو گئی۔ راجاں کے والدین نے ہمّت نہ ہاری اور شہر میں ضلع کے حاکم پاس پہنچے اور جھولی پھیلا کر اِمداد کی بھیک مانگی۔ حاکم ضلع نے درخواست ضلعی افسر پُولیس کے پاس بھیجی اور اُس نے وُہ درخواست اسی تھانیدار کے پاس بھیج دی۔ جس کے پاس راجاں کے والدین جا چکے تھے۔ راجاں کے والدین گاؤں کی گلیوں میں روتے پھرتے تھے۔ لیکن گاؤں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اِن کی امداد کر سکے — ہر ایک جانتا تھا کہ اس اغوا میں نمبردار کا ہاتھ ہے۔ راجاں کے بدنصیب والدین کئی بار نمبردار کے پاس گئے اور ہاتھ پاؤں جوڑے اور ہر بار اُس نے یہی کہا کہ راجاں

خود کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔ اس کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ـــــ اور نہ ہی وہ کچھ جانتا ہے۔

دن گذرتے گئے اور راجاں کے والدین کی امیدوں پر مایوسیوں کے بادل چھا گئے۔ یکایک ایک رات راجاں شکستہ حال گھر میں داخل ہوئی۔ ماں باپ نے بیٹی کو اس حال میں دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ گھر میں محشر کا سا سماں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گھر میں راجاں نہیں اس کی لاش آئی ہے۔ اس آہ و بکا میں راجاں صرف اتنا کہہ سکی کہ اس واقعہ میں نمبردار کے بیٹے کا ہاتھ ہے اور والدین بھی اس المناک سانحے سے متعلق کچھ زیادہ استفسار نہ کر سکے۔ یہ مصیبت یہیں ختم ہو جاتی تو خیر تھی۔ وقت ہر زخم بھر دیتا ہے۔ راجاں کے ماں باپ بھی اس حادثے سے سمجھوتہ کر لیتے۔ لوگ بھی بھول جاتے لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ راجاں اس ظلم و ستم کی ایک زندہ یادگار اپنے بطن میں محفوظ کئے ہوئے ہے۔ اور بظاہر اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ بیٹی نے ڈرتے ڈرتے اپنی ماں سے اور اس نے ایک درد اور کرب سے اپنے شوہر سے اس راز کا انکشاف کیا۔ باپ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور اس نے سوچا کہ وہ اپنی لختِ جگر کی گردن گھونٹ دے لیکن اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس کا ارادہ بدل گیا۔ اور وہ راجاں کو بے گناہ سمجھنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ خودکشی کر لے لیکن وہ اس سے بھی قاصر رہا۔

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو گم سُم، حیران اور پریشان کھڑی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن کس سہارے پر؟ کس امید پر؟

راجاں کی ماں کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ ایک دائی کے پاس پہنچی اس سے دوا کی ایک پڑیا لائی اور اپنی بیٹی کو کھلا دی لیکن جب بدنصیبی عروج کو پہنچ جائے تو کوئی ترکیب کارگر نہیں ہوتی۔ راجاں تڑپ تڑپ کر اس دنیا کو خیرباد کہہ گئی۔ ماں کی آنکھوں کے سامنے اس کی جواں لڑکی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ اور وہ حسرت و یاس کا عالم بنی اس منظر کو دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھامے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جنازے میں پورا گاؤں شامل تھا لیکن اس طرح کہ

ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور سر جھکے ہوئے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ بہ آوازِ بلند گریہ وزاری کر سکے کیونکہ نمبردار کا خوف غالب تھا۔ غصّہ غریب پر آتا ہے۔ نمبردار بہت بڑا امیر تھا۔ لیکن نمبردار کے انتقام کی آگ سرد نہیں ہوئی اور جب اسے علم ہوا کہ راجاں اس دُنیا سے کوچ کر گئی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے والدین نے اُسے زہر دے کر ہلاک کر دیا ہے۔ اس نے حاکم ضلع اور پولیس کے ضلعی افسر کو اپنے کارندوں کے ذریعے ایک درخواست بھجوائی کہ راجاں کے باپ نے بیٹی کو بدچلنی کے شبہ میں زہر دے کر ہلاک کر دیا ہے چنانچہ قانون کی اندھی اور بے درد مشین حرکت میں آگئی اور راجاں کے باپ کے ہاتھ ہتھکڑیوں سے جکڑ دیئے گئے۔

آج گورستان میں یہ ہنگامہ اسی تحقیقاتی سلسلے کی کڑی تھا۔

راجاں کی لاش کو قبر سے نکالا تو اس کی ماں کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن ذرا ہی دیر میں یہ چیخیں اس کے سینے میں ڈوب گئیں۔ کیمیائی تجزیہ مکمل ہو گیا۔ شیشیاں سر بمہر کر دی گئیں اور راجاں کی لاش قبر میں پھر اُتار دی گئی۔

راجاں کی ماں روتی پیٹتی اپنے گھر واپس آگئی۔ راجاں کے باپ کو جیل بھیج دیا گیا۔ تماشائی بکھر گئے۔ آخر میں ڈاکٹر، مجسٹریٹ اور محافظانِ قانون ماحضر تناول کرنے نمبردار کے ڈیرے پر چلے گئے۔

پیر سائیں

ضلع مظفر گڑھ میں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر نصیر پور نامی ایک بہت پرانا گاؤں ہے۔ آج سے تیس برس پہلے اس گاؤں میں کافی آبادی تھی اور بڑی رونق لیکن جب سے دریا بادشاہ کی توجہ اس طرف مرکوز ہوئی ہے یہ قصبہ برباد ہو گیا ہے۔ پرانی اینٹوں سے بنی ہوئی عمارتیں اس کی قدامت اور شان و شوکت کا پتہ دیتی ہیں۔ طغیانی کے دنوں میں دریا کی لہریں سرمایہ داروں کی حویلیوں کی قدم بوسی کرتی ہیں۔ لیکن غریبوں کے گھر ان کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔

ہزاروں ایکڑ سرسبز اور زرخیز اراضی جو یہاں کے زمینداروں کی ملکیت ہے اب ناقابل کاشت ہو چکی ہے۔ طغیانی کے بعد یہاں گھاس اُگ آتی ہے۔ اور اُن پر مال مویشی پالے جاتے ہیں۔ یہ فطری چراگاہیں بیلا کہلاتی ہیں۔ بیلے والے اِنہی کے دودھ مکھن سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ اور انہی کی تجارت بھی۔ اِن بیلوں میں چوریاں بھی کثرت سے ہوتی ہیں اور یہ چالاک چور ایک لمبے رسّے سے کئی جانوروں کو باندھ کر اور پھر اُسے اپنی کمر میں باندھ لیتے ہیں اور تیر کر دوسری جانب پہنچ جاتے ہیں۔

پچھلے سال گرمی میں جب سندھ اپنے پورے جاہ و جلال میں تھا نصیر پور کے ذیلدار

کی لڑکی کی شادی کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی جارہی تھی۔ ذیلدار نے اپنے خاندان کی قدیم روایات کے مطابق ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا ئے۔ اس بیاہ میں سینکڑوں لوگ بارات کی شکل میں نصیر پور پہنچے۔ آگے آگے ڈھول تاشے بجتے ہوئے۔ شہنائیاں گونجتی ہوئیں اور پیچھے پیچھے دولہا سہرا باندھے سفید رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ساتھ بے شمار عورتیں اونٹوں کے کجاوے میں بیٹھی گیت گاتی ہوئی چلی آرہی تھیں۔

ذیلدار نے بڑی شان و شوکت سے بارات کا استقبال کیا۔ ایک بڑے میدان میں مہمانوں کے آرام کے لیے سینکڑوں چارپائیاں ڈالوا دی تھیں اور اُن پر بستر لگوا دیئے تھے، نکاح خوانی کی رسم کے بعد مہمان نوازی کا دور شروع ہوا۔ انواع و اقسام کے کھانے نوکروں نے چارپائیوں کے سامنے لگوا دیئے جن میں پلاؤ، قورمہ اور میٹھے چاولوں کا انبار تھا۔ کھانے کے بعد دودھ کا دور شروع ہوا۔ ملازمین نے آفتابوں میں دودھ بھر کے مہمانوں کو پلانا شروع کیا۔ اور اتنا پلایا کہ ہر کوئی سیراب ہو گیا اور کوئی گنجائش نہیں رہی اس کے بعد لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے اور ہنسی مذاق کی محفلیں جم گئیں۔ نصیر پور کے غریب لوگوں نے یہ دھوم دھڑکا اس سے پہلے کب دیکھا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت محفوظ ہوتے۔

ابھی یہ محفل رقص و سرود برپا تھی کہ اچانک ایک پیر صاحب کا ظہور ہوا۔ نوجوان گورے چٹے۔ منڈا ہوا سر۔ پاؤں میں گھنگھرو۔ ہاتھ میں لوہے کا ایک کڑا۔ ٹخنوں تک کالے رنگ کا جبہ ناچتے گاتے محفل میں داخل ہوئے اور ایسا سماں پیدا کیا کہ تمام نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ "حق میرے مولا۔ یا میرے مولا" کا ورد کرتے ہوئے۔ وہ اِدھر سے اُدھر اُچھل اُچھل کر لوگوں پر گر پڑتے اور مرد اور عورتیں اُن کی ہنسی اُڑا رہی تھیں۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ مجمع سے ایک شخص اُٹھا اور سب کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"صاحبان! یہ خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ انہیں دریا کی لہروں پر چلتے

دیکھا ہے۔ یہ خُدا کی کریمی ہے کہ وُہ اِس شادی میں تشریف لے آئے ہیں۔ اُن کا مذاق نہ اڑائیے۔ اگر یہ ناراض ہو گئے تو سب مصائب کا شکار ہو جائیں گے۔"

یہ سُننا تھا کہ مجمع نے اُٹھ کر پیر سائیں کے پاؤں پکڑ لیئے۔ اور دست بستہ عرض کی۔

"بس پیر سائیں کافی ہو چکی ہے۔ اب آرام فرمائیے۔"

"کل رات ہم جنوں کی بارات میں شامل تھے۔ آج ہم تمہاری بارات میں آ گئے۔ اگر تمہیں پسند نہیں تو ہم تمہاری محفل سے چلے جاتے ہیں۔"

"نہ حضور ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ چلے جائیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ آرام کر لیں۔"

"اللہ کے ذکر سے ہم نہیں تھکتے۔"

یہ کہہ کر پیر صاحب نے پھر ناچنا شروع کر دیا۔ اور ڈھول والوں کو اشارہ کیا کہ وُہ ان کے ساتھ گت بجائیں۔ چنانچہ ان کے حُکم کی تعمیل کی گئی اور وُہ پھر۔

"حق میرے مولا۔ یا میرے مولا" کے نعرے لگانے لگے۔

ذیلدار سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اُس نے پیر صاحب کا بازو پکڑ کر ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔ اور اُسے دُودھ کا ایک گلاس دے کر کہا۔

"پیر صاحب کچھ دیر آرام کیجیئے۔"

"یہ کیا ہے۔؟" پیر سائیں نے پُوچھا۔

"حضور دُودھ ہے۔"

"دُودھ ہے؟ یہ تُم نے کہاں سے لیا۔"

ذیلدار نے بھینسوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ دُودھ ان بھینسوں کا ہے جو سامنے بندھی ہُوئی ہیں۔"

پیر سائیں نے پہلے تو بھینسوں کی جانب دیکھا پھر گلاس میں جھانک کر کہنے لگے۔

"بھینسیں کالی دُودھ سفید۔ حق میرے مولا یا میرے مولا۔"

یہ کہہ کر اُنہوں نے پھر ناچنا شروع کر دیا اور اتنا ناچے کہ لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ

ہو گئے لیکن پیر صاحب کو اُس کی کب پروا تھی۔ اُن کی زبان پر تو یہی تھا۔

"بھینسیں کالی۔ دُودھ سفید"

"حق میرے مولا۔ یا میرے مولا۔"

اسی وِرد میں پو پھٹنے لگی۔ ذیلدار نے پیر صاحب کے پاؤں پکڑ لیئے اور ایک چارپائی پر لا کر بٹھا دیا۔

"فقیروں اور درویشوں سے مذاق اچھا نہیں ہوتا۔"

ذیلدار نے مہمانوں سے مخاطب ہو کر کہا اور پیر صاحب کے پاؤں دبانے لگے۔

مہمان۔ میزبان اور نوکر چاکر تھکے ہُوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں سب ایسے سوئے کہ ایک دُوسرے کا ہوش نہ رہا۔ پیر صاحب بھی اس ریشمی بستر پر دراز ہو گئے۔ جو اُن کے لیئے خاص طور پر بچھایا گیا تھا۔

ابھی سپیدۂ سحر نمودار ہُوا تھا کہ ذیلدار کے نوکر چیختے چلاتے دوڑے ہُوئے آئے اور کہنے لگے۔

"بستی کی ساری بھینسیں چوری ہو گئیں۔ پچاس بھینسیں گُم ہیں۔ اُٹھیئے صاحبان چوری ہو گئی" تمام براتی ہڑبڑا کر اُٹھے۔ دیکھنے بھالنے کے بعد معلُوم ہُوا کہ تمام بھینسیں غائب ہیں اور ساتھ میں قبلہ پیر سائیں بھی۔ یہ دیکھ کر سب ایک دُوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے اور سب کے کانوں میں یہ آواز گونجنے لگی۔

"بھینسیں کالی۔ دُودھ سفید

حق میرے مولا۔ یا میرے مولا"

جیب تراش

سرما کی خُون منجمد کر دینے والی ایک رات میں مجھے دیہات سے شہر میں اپنے گھر واپس آنے کا اتفاق ہُوا۔ شہر کے بیرونی چوک کے قریب میں نے چند آدمیوں کا شور و غُل سنا لیکن جونہی میری موٹر اُن کے قریب پہنچی تو تین چار آدمی ایک نوجوان کو خُون میں لت پت چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وقت کافی گزر چکا تھا اور جاڑے کی شدّت سے سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔ میں نے گاڑی روک لی اور اس نوعُمر لڑکے کو جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور کافی صحت مند تھا۔ اُٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا۔ اس کی پُشت پر چاقو کے دو گہرے زخم تھے اور اگر میں وقت پر نہ پہنچتا تو اس کے حریف شاید اس کو ٹھکانے لگا چُکے ہوتے۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں اُسے اُٹھا کر شہر کے ایک مشہُور ڈاکٹر کے پاس لے گیا جہاں اس نے مرہم پٹی کے علاوہ اس مجروح کو دوا دی۔ اور ٹیکہ بھی لگایا۔ بروقت طبّی امداد سے اُس کی حالت سنبھل گئی۔ وہ مجھے متشکر نگاہوں سے دیکھ کر ملتجی ہُوا کہ اُسے مغلپورہ لیجا کر چھوڑ دیا جائے۔

"میری رائے میں تمہیں پُولیس اسٹیشن لے جانا بہتر ہو گا۔ تاکہ تُم ان بدمعاشوں کے خلاف قانُونی کارروائی کر سکو۔"

"مُجھے تھانے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان لوگوں سے خُود نپٹ لُوں گا۔"

میں کانپ گیا اور اس لڑکے کے سر پہ ہاتھ رکھ کر نصیحت کے انداز میں کہا۔

"لڑائی جھگڑا کچھ اچھی بات نہیں۔ تمہیں فوراً قانون کا سہارا لینا چاہیئے۔ میں تمہارے ساتھ چل کر رپورٹ درج کراؤں گا"۔

"میرا پیشہ مجھے تھانے میں اطلاع کرنے کی اجازت نہیں دیتا"۔

میں نے انتہائی حیرت سے اُسے دیکھا جس کا پیشہ چاقوؤں سے زخم کھانے کے بعد رپورٹ درج نہ کرنے کا تقاضا کرتا تھا۔ ہم مغل پورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں میرے ساتھی نوجوان نے ان الفاظ سے اپنا تعارف کرایا۔

میرا نام احمدو ہے۔ میری عمر بائیس سال سے کچھ زیادہ ہے۔ مجھے بچپن سے اب تک کئی بار تھانے جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں پانچ چھ مرتبہ مختلف عدالتوں سے چوری کے الزام میں سزا بھی پا چکا ہوں۔ تھانے والے مجھے مار مار کر تھک جاتے ہیں۔ لیکن مجھ پر ان اوچھے ہتھیاروں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میرے حوصلے بلند ہیں۔ میں کسی طاقت سے نہیں ڈرتا۔ دراصل یہ تھانے اور جیلیں اسی وقت تک ہیبت ناک معلوم ہوتی ہیں جب تک انسان کا اس سے واسطہ نہیں پڑتا۔ مجھے تو یہ مقامات اب تفریح گاہیں معلوم ہوتی ہیں۔ آرام و سکون یہیں ملتا ہے۔ میں جیب تراش ہوں لیکن اپنے پیشے پر شرمندہ نہیں ہوں۔ اس ملک کے اکثر بیروزگاروں کا یہی پیشہ ہے۔ ویسے تو اس معاشرے کا ہر فرد خواہ وہ کسی پیشے سے تعلق رکھتا ہو جیب تراش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انداز مختلف ہیں۔ میں ان سے زیادہ ضرر رساں نہیں ہوں۔ آپ شاید مجھے بُرا سمجھیں لیکن میں بہت سے لوگوں سے بہتر ہوں۔ امیر لوگوں کے لئے ترقی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ وہ ایک دن میں لکھ پتی ہو جاتے ہیں اور دوسرے دن کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔ غریبوں کے لئے یکلخت امیر بن جانے کی تمام راہیں بند ہیں۔ اگر کوئی امکان نظر آتا ہے تو اسی پیشے کے ذریعے سے۔ میرا باپ تانگہ بان تھا اور ابھی میں چھوٹی عمر کا تھا کہ وہ فوت ہو گیا۔ میری والدہ نے مجھے اور میرے تین بڑے بھائیوں کو بڑے دُکھ اُٹھا کر پالا۔ ہمارا ذریعہ

آمدنی نہ پہلے کچھ تھا نہ اب ہے۔ ہم چاروں بھائی یکے بعد دیگرے ایک دُوسرے کی دیکھا دیکھی جیب تراش بن گئے۔ اب اسے آپ مجبُوری سمجھ لیجئے یا کچھ اور۔ میرے تینوں بھائی مشّاق جیب تراش ہیں اور لمبی لمبی میعاد کی سزائیں کاٹ چکے ہیں۔ اب وُہ ماشاءاللہ آسُودہ حال ہیں اور اپنی اپنی پسند کی بیویاں لاکر اپنے گھر بسا چکے ہیں۔ محلّے والے ان کی بڑی عزّت کرتے ہیں۔ اب مَیں اپنے اس پیشے سے متعلّق کچھ عرض کروں۔"

مَیں اس کی صاف گوئی پر حیران ہُوا اور اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہُوئے کہا۔

اس دھندے میں بڑی احتیاط اور دیکھ بھال کے علاوہ انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی میں بہت پُھرتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے تو جتنا تجربہ زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی ہاتھ سُتھرا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن پتلی اور نوکدار اُنگلیوں والا شخص بہترین فنکار بن سکتا ہے۔ بالکل اِسی طرح جیسے ٹائپ کرنے والے اور ستار بجانے والی کی اُنگلیاں لمبی اور پتلی ہونا ضروری ہیں۔ جیب تراشوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وُہ جو بلیڈ یا قینچی وغیرہ کا اِستعمال کرتے ہیں اور دُوسرے وہ جو دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں اور انگوٹھے کے سہارے اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔ مشّاق جیب تراشوں کو بلیڈ یا قینچی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر جیب تراش کے لِئے بائیں کاندھے پر ایک موٹی سی چادر یا اِسی قِسم کا کوئی اور کپڑا لازمی ہوتا ہے۔ جیب تراشی کے وقت یہ کپڑا اپنے شِکار کے اُوپر ہوتا ہے۔ اور اس کی اُنگلیاں کام کر جاتی ہیں۔ میلے۔ اکھاڑے۔ ریلوے اسٹیشن۔ پلیٹ فارم۔ مُسافر خانے۔ بس اسٹینڈ۔ تانگے اڈّے۔ سینما اور تھیٹر غرض کہ جہاں بھیڑ ہوتی ہے۔ جیب تراشی کے لِئے موزوں ہوتے ہیں۔ ہم لوگ اپنا دھندا آزادانہ ماحول میں بھی کر لیتے ہیں۔ یہ صُورت تب ہوتی ہے جب ہمیں سرکاری نگہداشتوں کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ اس سرپرستی میں پکڑے جانے اور سزا پانے کا قطعی احتمال نہیں ہوتا۔ البتہ کمائی کا بیشتر حصّہ ان نگہداروں کی نذر ہو جاتا ہے۔ جو خلقِ خُدا کی دیکھ بھال پر مامُور ہوتے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ نگہدار ہم لوگوں کو باز اور شکرے کے نام سے پُکارتے ہیں اور کسی بڑے میلے

سے پہلے ہم لوگوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں۔

دیکھو میاں! تُم احتیاط سے اپنے سودے بھر لو۔ سودے بھرتے وقت اِدھر اُدھر کا پُورا خیال رکھنا۔ ہمیں ایسے باز نہیں چاہئیں جو پکڑے جائیں۔ ہاں سودا بھرنے کے بعد سیدھے ہمارے پاس آنا اور نصف و نصف کی تقسیم پر ایمان رکھنا۔ اگر کوئی ہیرا پھیری ہُوئی تو ہم سے زیادہ دُشمن کسی کو نہیں پاؤ گے۔"

ایسی صُورت میں ہم مطمئن ہو کر اندھا دُھند اپنا کام شرُوع کر دیتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کہیں پکڑے گئے اور شور شرابا ہُوا تو ہمارے سرپرست فوراً موقع پر پہنچ جاتے ہیں اور لوگوں کے سامنے دو چار تھپّڑ مار کر ایک کارکن کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وُہ ہمیں تھانے لے آتا ہے اور موقع پا کر ہمیں چھوڑ دیتا ہے۔

جیب تراش کی آمدنی غیر یقینی ہوتی ہے۔ کِسی دِن تو بغیر کِسی محنت اور خطرے کے سینکڑوں رُوپے مِل جاتے ہیں اور کِسی دن محنت شاقہ کے بعد بھی ایک پیسہ ہاتھ نہیں آتا۔ جب جیب تراش بُوڑھے ہو جاتے ہیں اور اُنگلیوں میں وہ پُھرتی نہیں رہ جاتی تو وہ سودا بھرنے کے قابل نہیں رہ جاتے اور یہ دھندا سکھانے کے لِئے نئے نئے لڑکوں کی تلاش کرتے ہیں اور اپنا ہُنر اُن میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یہ لڑکے اِدھر اُدھر جیبیں صاف کر لینے کے بعد شام کو اپنے اڈّوں پر پہنچ جاتے ہیں جہاں اُن کے سرپرست ان کے انتظار میں ہوتے ہیں اور اُن سے ساری رقم رکھوا لیتے ہیں۔ بعض مرتبہ ان فنکاروں میں بددیانتی کی وجہ سے ایسے چاقو اور چُھرے چلتے ہیں کہ الاماں! آج کا یہ واقعہ اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

مَیں اِس نوجوان کی راست گفتاری سے بہت متاثّر ہُوا اور مَیں نے اس سے اس کے پیشے سے متعلّق کسی بڑی دلچسپ واردات کی مثال چاہی جس سے اُسے کافی آمدنی ہُوئی ہو۔ وہ کہنے لگا۔

"سب سے زیادہ مایوسی اُس وقت ہوتی ہے جب ایک جیب تراش یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک شخص کافی سودا لیئے جا رہا ہے اور وہ اس کی جیب نہیں کاٹ سکتا تو وہ کسی دُوسرے جیب تراش کو اس کی جیب فروخت کر دیتا ہے اور وہ اس سے کچھ رقم حاصل کر لیتا ہے اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کامیاب ہو یا نہ ہو۔

پانچ چھ سال قبل کا ایک واقعہ ہے کہ ہمارے ایک دوست نے ہمیں اطلاع دی کہ اس بوڑھے ٹھیکیدار نے نیشنل بنک سے تیس ہزار روپے نکلوائے ہیں اور اب یہ کچہری کی طرف جا رہا ہے۔ مَیں متعلقہ شخص کو اچھی طرح دیکھ بھال کر کچہری کے احاطہ کے باہر دروازے کے ساتھ نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹھیکیدار ایک تانگہ میں کچہری سے باہر نکلا۔ جب وہ میرے پاس سے گُزرا تو میں نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ہائے مَیں مَر گیا۔ میرے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔ خُدا کے لِئے مجھے کوئی ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ مَیں نے دُوہرا ہونا شروع کر دیا۔ اور زمین پر لوٹنے لگا۔ ٹھیکیدار کو میری حالت پر رحم آ گیا اور اپنا تانگہ رُکوا کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ تانگہ والا میرا واقف نکلا لیکن مَیں نے ٹھیکیدار سے آنکھ بچا کر تانگے والے کو چُپکے سے دس رُوپے کا نوٹ نکال کر دے دیا اور یوں اس کی واقفیّت کو ناواقفیّت میں بدل دیا۔

مَیں نے درد سے بے چین ہو کر اِدھر اُدھر ڈھلکنا شروع کیا اور اپنی چادر کھول کر اس طرح اوڑھی کہ اس کا ایک پلّو ٹھیکیدار کے شلنے پر جا پڑا اور مَیں نے اپنے فن کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اس کے تیس ہزار میرے ہاتھ میں آ گئے۔ مَیں نے جلدی سے اپنی قمیص کے اندر کی جیب میں یہ رقم ڈالی اور ٹھیکیدار کا شکریہ ادا کر کے بظاہر ایک ڈاکٹر کے پاس اُتر کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ یہ رقم دو مہینے کھانے کے بعد فارغ ہو گیا کیونکہ ایسی رقم میں برکت نہیں ہوتی۔

مُغل پُورہ قریب آ چُکا تھا اور جہاں اُسے اُترنا تھا اُتر گیا۔ اُترتے ہوئے مجھے

کہنے لگا۔ ایک بات آخر میں یہ کہہ دُوں کہ مجھے نفرت کی نظر سے نہ دیکھئے گا۔ میرا پیشہ ملک کے غریب عوام کا نہایت محبوب مشغلہ ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ دُنیا کے کسی اور ملک میں اس پیشے کو اتنا فروغ نہیں جتنا اِس مُلک میں۔

اِس نوجوان کی دُکھ بھری داستان سُن کر میری آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو گئیں۔ منزلِ مقصُود پر پہنچ کر مجھے ادب سے سلام کر کے وُہ رُخصت ہو گیا۔ مَیں نے اپنے گھر کا رُخ کیا اور راستے میں نوجوان پود کی گُمراہی پر افسوس کرتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ اس کی اصلاح کا کوئی چارہ بھی ہے کہ نہیں۔

گھر آ کر جب میں نے کوٹ اُتارا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ میری جیب سے بھی میرا بٹوہ غائب تھا۔

سلیقہ شعاری

گھر کی مالی بدحالی اور خاوند کی بے رُخی کی وجہ سے رضیہ سخت پریشان تھی۔ اکلوتے بیمار لڑکے کو سینے سے لگائے سردی کی رات کو بارہ بجے تک جاگتی رہی۔ بچہ بخار میں تپ رہا تھا اور گھر میں دوائی کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ صبر و تحمل کی بھی حد ہوتی ہے۔ وُہ حفیظن جو اسے بازار سے سودا سلف لاکر دیا کرتی تھی دو دن سے غائب تھی کیونکہ اس بیچاری کو جو چالیس رُوپے ماہوار ملتے تھے وہ دو ماہ سے بند تھے۔ اب گھر والے خُود امداد کے طالب تھے۔ ایک سال کی معصوم بچی اور چار سال کا بیمار لڑکا مالکہ کے کام کاج میں کیا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ وُہ تو اسے ایک لمحہ کیلئے بھی اپنی دیکھ بھال سے غافل نہیں ہونے دیتے تھے۔

صُبح سویرے اُس نے نماز سے فارغ ہو کر اپنے خاوند کو ناشتہ دیا۔ رات کے بچے ہُوئے سالن کو گرم کر کے تین روٹیاں پکائیں۔ ایک روٹی باسی سالن سے شوہر نے کھالی اور باقی دو روٹیاں انڈوں کے آملیٹ کے ساتھ سفر طاس (ٹفن) میں رکھ لیں اور سائیکل پر چڑھ کر رفوچکر ہو گیا۔ یہی اُس کا معمول تھا۔ وقفہ کے دوران میں وُہ اپنا مختصر سا کھانا لیکر ایک پلاٹ میں بیٹھ جاتا اور اس کے دفتر کے ساتھی بھی اپنا اپنا کھانا لیکر اس کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ اس کا دفتر گھر سے تین میل کے فاصلے پر تھا اس لئے وہ دفتر سے گھر آ کر کھانا کھانے اور واپس جانے میں

قباحت محسوس کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اتنے عرصے میں بھی دفتر کا کام کرے اور اسے جلدی سے چھٹکارا مل جائے لیکن اس کا یہ مقصد پورا نہ ہوتا اور کام کی زیادتی کی وجہ سے اُسے گھر آنے میں تاخیر ہو جاتی۔ اس کی بیگم رضیہ اس محنت اور مجبوریوں کو نہ سمجھتی اور اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی لڑنا شروع کر دیتی۔ وہ اس ذہنی کوفت کے عالم میں کھانا زہر مار کرتا۔ لباس تبدیل کرتا اور کمرے میں جا کر لیٹ جاتا۔ اس واماندگی اور پریشانی کے عالم میں اُسے نیند آجاتی۔

میاں بیوی ایک ہی کشتی میں سوار تھے جو ہر وقت ڈگمگا رہی تھی اور ڈر تھا کہ کسی وقت بھی ڈوب سکتی تھی لیکن دو معصوم بچے اسے سہارا دیئے ہوئے تھے۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ کشتی ڈوب گئی تو ہمارے ساتھ دونوں بچے بھی غرق ہو جائیں گے اور یوں ایک گھرانے کا نام و نشاں مِٹ جائے گا۔

ایک سرد رات تھی۔ گیارہ بجے تھے کہ رشید نے باہر سے گھنٹی بجائی رضیہ نیم غنودگی کے عالم سے چونکی۔ اُس نے لڑکے کو اپنی آغوش سے بستر پر لٹایا اور دروازے کی طرف لپکی۔ اسی اثنا میں گھنٹی دوبارہ بجی۔ رضیہ جھنجلا گئی۔ اس نے کڑک کر کہا۔

آرہی ہوں! آرہی ہوں! اتنا صبر بھی نہیں ہو سکتا۔ گھنٹیوں پر گھنٹیاں بجا رہے ہو۔ عاصم کی آنکھ ابھی لگی ہے۔ یہ شور سُن کر جاگ اُٹھے گا۔ تمہارا کیا جائے گا۔ تم تو کھا پی کر سو جاؤ گے اور صبح تک کروٹ بھی نہیں بدلو گے۔ میرے نصیب میں بیمار بچے کو سینے سے لگا کر بغیر خادمہ کے کب تک چولھے کی راکھ پھانکتی رہوں گی۔ ناداری کا یہ عالم ہے کہ گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ اب تو ہمسائے بھی اُدھار نہیں دیتے۔

رشید حسبِ معمول سائیکل صحن میں رکھ کر کمرے میں چلا گیا۔ اور بیوی کی بک بک سے بے پرواہ ہو کر کپڑے بدلنے میں مصروف ہو گیا۔ فارغ ہو کر اُس نے آواز دی "عاصم کی ماں۔ کھانا لے آؤ۔"

"حاضر کرتی ہوں جناب۔ یہ رہی مونگ کی دال اور روٹیاں اب گھر میں اس کے سوا

ہے بھی کیا۔ صبح کے لِئے انڈے بھی نہیں۔ ناشتہ اسی دال سے کرنا اور دوپہر کے کھانے کا انتظام دفتر ہی میں کر لینا۔ میرے پاس تو کچھ نہیں۔"

رشید غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہے لے آؤ۔"

"آپ کو میری بکواس سُننا پڑے گی۔ مَیں سارا دن اس چار دیواری میں قید رہ کر بغیر خرچ کے گھر نہیں چلا سکتی۔ لڑکا بیمار ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لیجانے کے لئے کوئی آدمی نہیں۔ بازار سے سودا لا کر کون دے۔"

"اس میں میرا کیا قصور۔ مَیں تو ساری تنخواہ تمہارے حوالے کر دیتا ہُوں۔"

"اس کا حساب مجھ سے ابھی لے لیں۔ چار سو میں سے سو روپیہ مکان کا کرایہ۔ بیس روپے بجلی کے دس روپے مہترانی کے۔ دس روپے بہشتی۔ تیس روپے دھوبی۔ ایک سو بیس کریانہ والے کے اور پینتیس روپے جناب کی خدمت میں حاضر کر دیتی ہوں۔ اس کے علاوہ صابن تیل۔ بچے کی دوائی۔ جلانے کی لکڑیاں۔ آپ کی حجامت کے لِئے بلیڈ۔ دانتوں کا منجن جوتوں کی پالش۔ یہ سب چیزیں کہاں سے لاؤں اور یہ اخراجات کس طرح پُورے کروں۔ یہ بھی کان کھول کر سُن لیجئے کہ درزی کے بِل کے علاوہ لحاف بھروانے کے لِئے رُوئی بھی نہیں ہے۔"

"مَیں تھکا ہُوا ہوں۔ دفتر میں اتنا کام ہوتا ہے کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ خُدا کے لِئے میرے پاس سے چلی جاؤ۔ دُور ہو جاؤ۔"

"میرے دُور ہونے سے مصیبتیں تو دُور نہیں ہو سکتیں۔ مجھے بتائیے کہ مَیں اِس بیمار بچّے کو بغیر دوا کے کب تک سینے سے لگائے رکھوں۔ بچہ یُوں تو ٹھیک نہیں ہو جائے گا۔"

"تمہاری طرح اور بھی کئی عورتیں ہیں جو چار سو روپے سے بھی کم آمدنی میں گزارا کرتی ہیں۔ لیکن وُہ تمہاری طرح ہر وقت روتی پیٹتی نہیں رہتیں اور کسی گھر کی بربادی کا یہ عالم بھی نہیں۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ اس فاقہ کشی میں میرا ہاتھ ہے۔ اور یہ فاقہ کشی میری بد انتظامی

کی وجہ سے ہے۔ آپ گھر کا خرچ اپنے ہاتھ میں لے لیں پھر میں دیکھوں گی کہ کونسا انقلاب آجاتا ہے۔ میں تو اب اس ناداری سے تنگ آچکی ہوں۔" اب مجھ میں خود اس عذاب کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہی۔ سارا دن قلم گھسنے کے بعد رات کو بھی آرام نہیں ملتا۔ خدا کا قہر ہے جو تمہاری شکل میں مجھ نازل ہو رہا ہے۔ اس بچے کا کیا ہوگا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس کون لے جائے گا۔ اس کے لیے دوائی کے پیسے کہاں سے آئیں گے پچھلے مہینے میں نے سلمیٰ سے پچیس روپے اُدھار لیے تھے۔ وہ بھی ابھی تک واپس نہیں کیے۔ اب کس منہ سے مزید قرض مانگوں۔"

سلمیٰ کا خاوند میرے دفتر میں ملازم ہے۔ اس کی تنخواہ مجھ سے بھی کم ہے۔ لیکن اس کی سلیقہ شعاری دیکھو کہ اسے کبھی قرض لینے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ دوسروں کو قرض دیتی ہے۔"

"سلمیٰ پردہ نہیں کرتی۔ ضرورت کے وقت وہ خود سودا سلف خرید لاتی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس خود چلی جاتی ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ میرے لیے پردے کی مجبوری ہے۔

پردے کی مجبوری اور گھر کے افلاس کا کیا تعلق اور اگر ہے بھی تو پردے کا پھندا خود تم نے اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ لڑکا مر رہا ہو اور تم پردہ کیے گھر میں بیٹھی رہو۔"

"تو آپ کو میرا پردہ ناپسند ہے۔؟"

مجھے تمہارا پردہ اور قدامت پسندی دونوں ناپسند ہیں۔ یہ زمانہ اب دقیانوسی روایات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ موجودہ زمانے میں عورت اور مرد ایک گاڑی کے دو پہیے سمجھے جاتے ہیں۔ وہ دن گئے جب مرد ہی ہر کام کیا کرتا تھا۔ اب زندہ رہنے کے لیے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ہو کر حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر میرے اور اپنے لئے نہیں تو اپنے بچے کے لیے تمہیں ڈاکٹروں کے پاس جانا ہوگا۔ بازار سے سودا سلف لانا ہوگا۔ اور ایک ایک کوڑی بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانا ہوگی۔ اگر تم مریم بی بی بن کر بیٹھی رہو گی تو گھر کا کاروبار کیسے چلے گا۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ مجھے سلمیٰ کی پیروی کرنا چاہیئے"

"کیوں نہیں۔ سلمیٰ بڑی سلیقہ شعار عورت ہے۔ اس کے گھر کی یہ حالت نہیں جو تمہارے گھر کی ہے۔ ایک دن اُس کا شوہر مجھے اپنے گھر لے گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ صاف سُتھرا گھر۔ ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہوئی ہنستے کھیلتے بچے۔ خوشگوار ماحول۔ میاں بیوی کے دل احترام و محبت سے بھرے ہوئے۔ کھانا اس قدر ذائقہ دار کہ لطف آگیا۔ سلمیٰ کے گھر جانا اور اس سے سبق حاصل کرنا۔"

رضیہ ساری رات جاگتی رہی۔ اسے اس گفتگو سے آشکار ہوا کہ پرانی اخلاقی قدروں کی بنا پر بسنا مشکل ہی نہیں ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی گھر کی بربادی کی ذمہ دار ہے۔ اس کا معصوم بچہ بغیر علاج کے صرف اس وجہ سے تڑپ رہا ہے کہ وہ قدامت پسندی کی طرف مائل ہے۔ وہ اگر سلمیٰ کی طرح پردہ ترک کر دے تو ڈاکٹر سے دوائی لانا کوئی مشکل نہیں۔ سلمیٰ کا شوہر اس سے کتنا خوش ہے کیونکہ سلمیٰ اس کی آسائش کا ہر طرح کا خیال کرتی ہے۔ اس کے برعکس اپنا شوہر تمام دن کام کرنے کے بعد بھی آرام نہیں پاتا۔ اسے اپنے رشید پر رحم آنے لگا۔ اور اپنے طرزِ زندگی کو بدلنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے لگی اور طلوع سحر کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

علی الصباح رضیہ جاگی۔ اسے بچے کی بیماری اور شوہر کی افسردگی کا بہت ملال تھا۔ اس نے جلدی جلدی رشید کے لیے روٹیاں پکائیں۔ رشید نے باسی دال سے ناشتہ کیا۔ بلیڈ کو شیشے کے گلاس میں رگڑ کر حجامت بنائی۔ دانتوں کو برش میں صابن سے مل کر صاف کیا اور سرہانے سے نکال کر بغیر استری کے پتلون پہنی اور دو روٹیاں سائیکل کے کیریئر پر رکھ کے رضیہ سے بغیر بات کئے گھر سے نکل گیا۔ وہی اجاڑ گھر۔ وہی تنہائی۔ وہی بے سر و سامانی اور وہی پریشان حالی۔ لیکن اب رضیہ کے خیالات یکسر بدل گئے تھے اور وہ ایک نئے اور خوبصورت مستقبل کا خواب دیکھنے لگی۔ شوہر کے چلے جانے کے بعد اُس نے بچے کو اپنے سینے سے لگایا۔ اور سیدھی سلمیٰ کے گھر

پہنچ گئی۔ سلمیٰ گھر میں ریڈیو لگائے بچّوں کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی۔ رضیہ کو دیکھ کر وہ خوش ہو گئی اور اس کی دونوں بچیاں بھی۔

"آؤ رضیہ بہن۔ آج اس طرف کیسے نکل آئیں۔؟ سلمیٰ! میری مجبوری تمہارے پاس لے آئی۔ میرا لڑکا بیمار ہے۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ اور مجھے اتنے پیسے بھی دے دو کہ میں اس کی دوا لے سکوں۔ تمہارا احسان ہو گا۔"

"دوا کے پیسے نہیں تو کیا ہے۔ میں تمہیں دیتی ہوں۔ تم بچے کا علاج کرو اور گھبراؤ نہیں۔ پہلے میرے ساتھ ناشتہ کرو پھر ساتھ چلتے ہیں۔"

رضیہ نے سلمیٰ کے گھر کی چہل پہل سے اپنے گھر کے ماحول کا تقابل کیا تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ سلمیٰ نے اسے چونکایا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

"سلمیٰ میں گھر کی پریشانیوں سے تنگ آ گئی ہوں۔ مجھے زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھا دو۔"

"رضیہ! تم انتہائی نیک ہو۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہو۔ کسی غیر محرم سے بات کرنے کو تیار نہیں۔ تمہیں خاوند اور بچّوں سے کیا غرض۔ یہ تو دنیا داروں کے جھگڑے ہیں۔ بھاڑ میں جائے گھر اور گھر والے۔ تم اپنی تسبیح و تہلیل میں فرق نہ آنے دو۔ نیک لوگ ہر قسم کے رشتوں اور بندھنوں سے آزاد ہوتے ہیں اگر خاوند دوسری شادی بھی کر لے تو جوتی کی نوک پر مارو۔ بچّے بھوک سے مر جائیں تو تمہاری بلا سے۔ ارے پگلی! یہ گھریلو ذمہ داریاں تم جیسے لوگوں کے بس کا روگ نہیں۔"

"سلمیٰ میں بہت پریشان ہوں مجھے ڈاکٹر کے پاس لیکر چلو۔ بچّے کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

وہ تو تمہیں لیکر چلتی ہوں لیکن ڈاکٹر کے پاس جانے سے کچھ نہیں بنے گا۔ وہ ادھار دوا تو دے دے گا۔ لیکن تمہارے گھر کا خرچ نہیں چلا سکتا۔ رضیہ تمہیں کچھ اور بھی کرنا ہو گا۔

رضیہ چلو میں تمہیں بشیراں کے چوبارے پر لے کر چلتی ہوں۔ اگر تم بشیراں کے چوبارے پر نہ گئیں تو تمہیں کہیں اور جانا ہو گا۔ رضیہ اُس زمانے میں جب تک مرد اور عورت مل کر کام نہ کریں تب تک گھر کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔"

"میرا خاوند بھی یہی کہتا ہے لیکن میں کیا کروں۔ کیا مجھے کوئی مزدوری نہیں مل سکتی۔"

"مل سکتی ہے لیکن بشیراں کے چوبارے پر۔"

"وہاں مجھے کیا کام کرنا ہو گا۔؟"

"رضیہ وہاں تمہیں لوگوں کی آغوش میں پہنچ کر اس کی قیمت وصول کرنا ہو گی۔"

رضیہ نے شرم سے سر نیچا کر لیا۔ سلمیٰ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

پگلی کہیں کی! یہ بازاروں میں تمہیں جو فیشن پرست ہنستی کھیلتی اور مردوں سے آنکھیں لڑاتی نظر آتی ہیں یہ رئیسوں کی بیٹیاں نہیں ہوتیں۔ بڑے آدمیوں کی بیٹیاں بازاروں میں گھوما پھرا نہیں کرتیں کیونکہ ان کے گھر میں تو ہر قسم کے عیش و آرام کا سامان موجود ہوتا ہے۔ یہ تو ہم تم جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کے خاوند سویرے سویرے دکانوں۔ دفتروں اور کارخانوں میں چلے جاتے ہیں اور وہ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے گھر سے نکل آتی ہیں۔ دنیا جس قیمت پر اُنہیں آسائش دیتی ہے وہ ادا کر دیتی ہے۔

"لیکن سلمیٰ ایک مصیبت زدہ اور فاقہ کش عورت کو کون قبول کرے گا۔"

"مصیبت زدہ اور فاقہ کش تو تم خود ہی بن گئی ہو۔ تم نے آئینے میں اپنی صورت نہیں دیکھی تمہاری تو ایک نظر آسودگی کو تمہارے قدموں میں ڈال دے گی۔"

"سلمیٰ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ ڈر تو تمہیں شادی کے وقت بھی معلوم ہوا ہو گا۔"

"ہاں! لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

سلمیٰ کھِل کھِلا کر ہنسی۔

"گناہ! سُبحان اللہ! ارے گناہ اور ثواب تو اُن لوگوں کی اصطلاحیں ہیں جو آسودہ حال ہیں۔ جب زندگی موت سے بھی مُشکل ہو جائے تو گناہ گناہ نہیں رہتا اور پھر یہ کہ تُم عیّاشی کی خاطر تو ایسا نہیں کر رہی ہو۔ اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو یہ راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"سلمٰی! میں بڑے نیک ماں باپ کی بیٹی ہُوں۔ اگر کسی کو معلُوم ہو گیا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔"

"تو تُم یہ تسلیم کر رہی ہو کہ گُناہ سے نہیں تہمت گُناہ سے ڈر رہی ہو۔ اگر کوئی بُرائی مخفی رہے تو بُرائی نہیں رہتی۔ یہ بتاؤ کہ تُمہاری پرہیزگاری نے تُمہیں کیا دے دیا۔"

"سلمٰی! میں تمہارے سوا اور کسی کو اپنا محرم نہیں سمجھتی۔ اِس لیئے میں اپنا معاملہ تمہارے سُپرد کرتی ہُوں لیکن اس کا خیال رکھنا کہ اپنی بہن کی طرح میری بدنامی اپنی بدنامی سمجھو گی۔"

"بے فکر رہو رضیہ۔ اِنسان۔ اِنسان کے کام آتا ہے۔"

میں بھی بشیراں سے پہلے واقف نہیں تھی۔ مُجھے ایک سہیلی وہاں لے گئی۔ اس کے بعد مُجھے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس نہیں ہُوئی۔ چلو تُمہارے بچّے کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں اس کے بعد بچّے کو میرے گھر میں چھوڑنا پھر میں تُمہیں وہاں لے چلوں گی۔"

سلمٰی رضیہ کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے دوا دی اور رضیہ سلمٰی کے گھر میں بچّے کو چھوڑ کر نئے راستے پر چل پڑی۔ سلمٰی نے نئی منزل سے رضیہ کو آشنا کرایا۔ تو رضیہ کی آنکھیں کُھل گئیں اور جھجک بھی جاتی رہی۔ وُہ جب گھر واپس آئی تو تمام مُشکلات دُور ہو چُکی تھیں۔ اِس کی جیب ایک نا آشنا شئے سے بھاری ہو رہی تھی۔

شام کو رشید گھر آیا تو گھر کا بدلا ہُوا نظام دیکھ کر حیران ہو گیا۔ ہر چیز سلیقہ سے اپنی جگہ رکھی ہُوئی۔ مکلف کھانے کے ساتھ خُوشبُودار چائے بھی سامنے رکھی ہُوئی۔

بیگم نے مُسکرا کر اس کا اِستقبال کیا۔ بابُوجی نے جب بیگم اور بچّوں کو فرخندہ حال پایا تو اُس کی ساری تکان دُور ہو گئی۔

مہمان نوازی

موسم سرما کی ایک اندھیری رات میں بے آب و گیاہ پہاڑیوں کے درمیان ناہموار راستوں پر ایک بس ہچکولے کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ جس کی پچھلی نشستوں پر بشیرا اور نذیراں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دُوسرے کے بالمقابل بُت بنے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اور اُن کی منزل قریب آتی جا رہی تھی وہ دہشت زدہ ہو رہے تھے۔ خُدا جانے اُنہیں تقدیر کِس سمت لیئے جا رہی تھی۔

نذیراں نے ساری عُمر میں اتنا لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ اور بشیرا بھی کبھی اپنے گھر سے اتنی دُور نہیں گیا تھا۔ جگہ جگہ بس ٹھہرتی رہی۔ مُسافر اُترتے اور چڑھتے رہے۔ لیکن اس اجنبی جوڑے کو اس ماحول کا قطعی کوئی احساس نہیں تھا۔ وُہ اپنی سوچ میں گم تھے۔ نذیراں بشیرے کو برقعے سے چُھپکے چُھپکے دیکھ رہی تھی۔ یہی تو ہے جسے وُہ بچپن سے چاہتی تھی۔ وہ اس کی آرزوؤں کا حاصل تھا اور اسی کے خوابوں نے اس کی نوعمری کی اکیلی راتوں میں رنگ بھرے تھے۔ اسے اُمید تھی کہ اُس کے گھر میں بارات آئے گی۔ آتشبازی چھُوٹے گی۔ شہنائیاں بجیں گی۔ سہیلیاں مہندی لگائیں گی۔ ماں باپ ڈولی میں سوار کرائیں گے۔ لیکن یہ ملاپ کی دہشت انگیز رات۔ یہ اجنبی دیس۔ امید و بیم کے ہچکولے کھا ور تفکرات کے اتھاہ اور گہرے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اس کے دل میں کئی

بار آیا کہ وہ واپس چلی جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اُس پر گھر کے دروازے ہمیشہ کیلئے بند ہو چکے تھے۔ بشیرے کی حالت بھی کچھ یہی تھی۔ بے سرو سامانی۔ نہ کوئی دوست، نہ کسی سے واقفیت۔ پرایا شہر۔ کہاں کہاں ٹھوکریں کھائے گا۔ اگر نذیراں کے وارث تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو خُدا جانے کیا حشر ہو۔ وہ یہ سوچ کر کانپنے لگتا۔ بس کے اگلے حصّے میں ایک مُسافر نے سگریٹ کا ایک کش کھینچا اور اپنی بھونڈی آواز میں نغمہ سرا ہُوا۔

مُل وکدا سجنڑ مل جاوے

لے لواں میں جند ویچ کے

" اگر میرا ساجن مجھے کسی جگہ بکتا ہُوا مل جائے تو میں اُسے اپنی جان بیچ کر بھی خرید لوں۔"

نذیراں کی ڈھارس بندھی۔ وُہ پہلی عورت نہیں تھی جس نے اپنے محبُوب کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑا۔ کوئی پروا نہیں۔ سُوکھی روٹیاں کھا کر زندگی بسر ہو جائے گی۔ لیکن اس کا ساجن اس کے سامنے رہے۔ اس نے مُحبت بھری نظروں سے بشیرے کو دیکھا جو اندیشوں میں گم تھا۔ نغمہ سرائی ختم ہُوئی اور اس کے تاثرات بھی۔ پھر وہی کالی رات۔ خُون منجمد کر دینے والی سردی۔ پہاڑی رستوں پر دوڑتی ہُوئی بس۔ اس کے علاوہ چاروں طرف خطرات کے ناچتے ہُوئے بھوت۔

سفر کٹتا جا رہا تھا اور مُسافروں کی زبان میں بھی فرق آتا جا رہا تھا۔ جس سے یہ دونوں ناآشنا تھے۔ ایک مقام پر چیکر بس میں چڑھا۔ سواریوں کی گنتی کی پھر رسید بُک دیکھی۔ پھر سواریاں گنیں اور آخر میں کڑک کر کنڈیکٹر کو آواز دی۔

ارے میاں رسید بُک میں چوبیس سواریاں درج ہیں۔ لیکن ہیں پچیس۔ یہ کیا معاملہ ہے؟

کنڈیکٹر نے وہیں سے کھڑے کھڑے نہایت ادب سے جواب دیا۔

" مولوی جی۔ سواریاں تو چوبیس ہیں لیکن ایک مُردہ ہے۔"

" ایک مُردہ ہے؟ مولوی جی نے حیران ہو کر پُوچھا۔"

" جی ہاں۔ سواریاں چوبیس ہیں اور ایک پُولیس کا سپاہی۔"

بس کے لوگ زعفران زار بن گئے اور سپاہی نے کھسیانی ہنسی ہنس کر مونچھوں پر تاؤ دیا۔ نذیراں اور بشیرا بھی دم بھر کو مسکرائے لیکن پھر وہی سکوت۔ طلوع سحر سے کچھ پہلے بس اس مقام پر پہنچ گئی جس کے لئے بشیرے نے ٹکٹ لئے تھے۔ بس اسٹینڈ پر کھڑا یہ جوڑا اس اجنبی شہر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ بشیرے کے پاس تیس روپے باقی رہ گئے تھے۔ دونوں بس اسٹینڈ سے نکل کر ایک نانبائی کی دکان پر پہنچے۔ وہاں بشیرے نے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو دیکھا۔ خوش پوش۔ سر پر لنگی والی پگڑی۔ چہرے پر ابھرتی ہوئی مونچھیں اس کی ثروت اور باوقار ہونے کی دلالت کر رہی تھیں۔ بشیرے نے توکّل کر کے انتہائی لجاجت کے لہجے میں خان صاحب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جناب میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ دسویں جماعت تک تعلیم ہے۔ آپ روزگار کے حصول میں میری امداد فرمائیں۔ خان صاحب نے بشیرے کو مسکرا کر دیکھا۔ بشیرے کا حوصلہ بڑھ گیا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"میں پردیسی ہوں۔ میرا گھر یہاں سے دو سو میل کے فاصلے پر ہے"۔

"یہ عورت تمہارے ساتھ کون ہے"۔

"یہ میری بیوی ہے"۔ بشیرے نے جواب دیا۔

"اچھا تم آج کا دن سرائے میں گذارو میں کسی کام سے شہر کے باہر جا رہا ہوں۔ واپسی میں اپنی موٹر میں بٹھا کر تمہیں ایک نواب صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ میرے دوست ہیں اور بڑے غریب پرور۔ انہوں نے مجھ سے کبھی کہا تھا کہ ان کی ایک شہری جائیداد کی دیکھ بھال کے لئے پڑھے لکھے ایک نوجوان کی ضرورت ہے"۔

"تو آپ وہاں مجھے ملازم کرا دیں گے"؟۔

"ضرور۔ آپ ہمارے شہر میں مہمان ہیں۔ مہمان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ ملازمت آپ کو مل جائے گی۔ آپ اطمینان رکھیں"۔

اس دلاسے سے بشیرے اور نذیراں کو تسلی ملی اور سرائے میں کرایہ پر کمرہ لیکر سستانے لگے۔ اور مستقبل

کے خوابوں میں کھو گئے۔ خان صاحب ذرا دیر سے آئے اور کہنے لگے۔

"میں نواب صاحب سے مِل آیا ہوں۔ اُنھوں نے آپ کو مُلازم رکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ پانچ سو رُوپیہ ماہانہ ملیں گے۔ لیکن آپ بھی محنت سے کام کریں۔"

"خان صاحب۔ ہم دونوں رہیں گے کہاں۔؟"

گھبرائیے مت۔ نواب صاحب کی کوٹھی کے باہر نوکروں کے کوارٹروں میں سے ایک آپ کو بھی مِل جائے گا۔

نواب صاحب کے بیٹے کی شادی ہے اور اِسی سلسلے میں اُن کی کوٹھی میں عورتیں جمع ہیں تو آپ ایسا کریں کہ اپنی بیوی کو اندر بھیج دیجیے گا تاکہ انتظام میں بیگم صاحبہ کا ہاتھ بٹالے۔

دونوں نے اطمینان کا سانس لیا اور خان صاحب کی موٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے شہر سے باہر موٹر ایک خُوبصُورت بنگلے میں داخل ہُوئی۔ نوکروں نے نواب صاحب کو اطلاع دی اور تھوڑی دیر میں نواب صاحب نے دونوں کو شرف حضُوری بخشا۔ نواب صاحب جو ایک لحیم شحیم جثّے کے مالک تھے۔ بات کرنے میں سبقت کرتے ہُوتے فرمایا۔

"دیکھو میاں اگر تُم نے محنت سے کام کیا اور ہم خوش ہُوئے تو پانچ سو سے بھی زیادہ بڑھا دیں گے۔ فی الحال بنگلے سے شادی تک دو وقت کا کھانا تمہیں مِلے گا۔ بعد میں تم خُود انتظام کر لینا۔ اِس وقت تم اپنی اہلیہ کو زنان خانے میں بھیج دو اور تُم مہمان خانے میں قیام کرو وہاں بستر کا انتظام ہے۔"

نواب صاحب نے کچھ اِس تمکنت اور وقار سے بشیرے کو یہ پروگرام سمجھایا کہ اسے بات کرنے کی جُرأت نہیں ہُوئی۔ نذیراں زنان خانے میں پہنچا دی گئی اور بشیرا مہمان خانے میں نواب صاحب کے ملازمین نے بشیرے کو اتنا کِھلایا کہ اُس کا جی بھر گیا۔ وہ تھکا ہُوا تھا اور بھُوکا بھی اور کھانے میں بھی ایسی آرام دہ چیز موجُود تھی۔ وہ بستر پر ایسا لیٹا کہ اُسے صُبح تک ہوش نہ رہا۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد بھی اُس کی آنکھوں میں غنودگی موجُود تھی۔ اُسے فوراً نذیراں کا خیال آیا۔ وہ تیز تیز

قدم اُٹھاتا ہُوا مہمان خانے سے نواب صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔ نواب صاحب برآمدے میں کُرسی پر بیٹھے سُنہری دُھوپ سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔

"میری بیوی کہاں ہے جناب۔؟"

نواب صاحب نے بڑے سکُون سے ہاتھ سے ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ بشیرے نے کمرے میں نذیراں کو غافل سوتے ہُوئے پایا۔ بشیرے نے بے تابی سے پُکارا۔ نذیراں، نذیراں نے مُشکل سے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے بولی۔ "چلو بشیرے یہاں سے جلدی چلو"

اس سے آگے وُہ کچُھ نہ کہہ سکی۔ اور نہ بشیرے کو کچُھ پُوچھنے کی جُرأت ہو سکی۔

بشیرے نے نذیراں کا ہاتھ تھاما اور نواب صاحب کو سلام کئے بغیر ایک رات کے یہ مہمان بنگلے سے رُخصت ہو گئے۔

بردباری

موسم سرما کی آدھی رات میں میاں صاحب کے زنان خانے سے شور و غل بلند ہوا۔ بجلی کی بتیاں روشن ہو گئیں اور نوکروں نے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔ اس غل غپاڑے میں میاں صاحب کے بڑے لڑکے سعید میاں کی گرج دار آواز سنائی دی۔

"مارو اس حرام زادے کو۔"

"پاجی کہیں کا۔"

"اس کی مشکیں کس لو۔"

"اس کی ہڈیاں توڑ دو۔"

تھوڑی ہی دیر میں لاتوں اور مکّوں کی دنادن کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ساتھ ہی چیخنے کراہنے کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ایسی جیسے تھانے کی ہمسائیگی میں رہنے والے اکثر سنتے ہیں۔

بڑے میاں صاحب کا شمار شہر کے بڑے رئیسوں اور سیاست دانوں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی حلیم الطبعی اور خوش اخلاقی کی بنا پر ہر دلعزیز تھے۔ ان کو کسی نے کبھی اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ لیکن ان آوازوں سے چونک کر بیدار ہوئے اور اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچے اور کڑک کر پوچھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" "ابّا جان یہ بدمعاش ہے"
"کون بدمعاش ہے؟" کیا معاملہ ہے۔
"یہ ساتھ والی مِل کے مالک کا بیٹا ہے اور یہ آپا شہناز کی خواب گاہ سے نکلتا ہُوا پکڑا گیا ہے۔"
نواب صاحب نے غُصّے سے لڑکے کو دیکھا اور نوکروں کو گھورا۔ سب سہم گئے۔ نوکروں نے مُجرم پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ لیکن وُہ مُردے کی طرح بے جان اور گم سُم دہشت کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال پریشان تھے اور ماتھے سے خُون بہہ رہا تھا۔ پہلی بار میاں صاحب کا غیض و غضب دیکھ کر نوکر لرزہ براندام تھے۔ میاں صاحب نے ایک نظر اپنے لڑکے پر ڈالی اور اس سے پُوچھا۔
"تو تمہاری نظر میں یہ چور ہے؟"
"نہیں ابّا جان یہ چور نہیں بدمعاش ہے۔" "بدمعاش ہے۔ کیا بکواس کر رہے ہو؟"۔
میاں صاحب غصّے سے لال پیلے ہو رہے تھے اور اسی عالم میں وُہ گویا ہُوئے۔
"تُم سب اپنے کمروں میں جاؤ۔ سعید میاں تُم بھی جاؤ۔ اور اس نوجوان کو میرے کمرے میں بھیج دو۔"
میاں صاحب کے حُکم کی تعمیل میں سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اور یہ نوجوان میاں صاحب کے کمرے میں اس صُورت سے داخل ہُوا کہ قدم بوجھل۔ نگاہیں نیچی اور جسم لرزیدہ تھا۔ اس کی سمجھ میں کُچھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلُوک کیا جائے گا۔ وُہ چُپ چاپ میاں صاحب کی طرف دیکھے بغیر ان کی چارپائی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔
"بیٹھ جاؤ۔" میاں صاحب نے کُرسی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا اور لڑکا خاموشی سے کُرسی پر بیٹھ گیا۔
تمہارے سر میں چوٹ لگی ہے۔ خُون بہہ رہا ہے۔

"جی ہاں! آپ کے نوکروں نے مجھ سے زیادتی کی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے بیٹیا۔ یہ لوگ جاہل ہیں۔ اگر ان میں عقل یا تمیز ہوتی تو یہ لوگ ایسا نہ کرتے۔"

"جناب اُنہوں نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔"

"مجھے یقین ہے تُم بے گناہ ہو۔"

میاں صاحب یہ کہہ کر اُٹھے۔ میز کی دراز سے ٹنکچر کی شیشی اور رُوئی نکال کر لڑکے کے زخم خوردہ ماتھے پر لگانے لگے۔ لڑکا بھی احتراماً کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں ٹنکچر لگائے دیتا ہوں ابھی خُون بند ہو جائے گا۔"

میاں صاحب نے ٹنکچر لگانے کے بعد کنگھی دی کہ وُہ اپنے بال دُرست کرے۔ میاں صاحب کی اس شفقت سے لڑکے کے دل سے خوف جاتا رہا اور اس نے عاجزانہ کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے میاں صاحب۔"

"اس کی ضرورت ہے بیٹے۔ یہ وحشت کا انداز اچھا نہیں۔"

میاں صاحب نے اتنا کہہ کر گھنٹی بجائی اور نوکر سے چائے لانے کا حکم دیا۔ ذرا دیر میں چائے آگئی اور دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

دیکھو میاں! یہ جوانی ہر ایک پر آتی ہے۔ مَیں جانتا ہُوں کہ ان ایام میں اِنسان حیوان کی طرح ہوتا ہے۔ مَیں جانتا ہُوں کہ ایسے عالم میں کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ لیکن بڑے بچّوں کو اپنے تجربات کی رَوشنی میں سمجھاتے ہیں۔ دیکھو مثل مشہور ہے کہ۔ بد سے بدنام بُرا۔ اِس لیے مَیں تمہیں تلقین کرتا ہُوں کہ احتیاط سے کام لو۔ ایسا کوئی قدم نہ اُٹھاؤ جس سے تمہاری یا تمہارے والدین کی بدنامی ہو۔ تُم جانتے ہو کہ اس مُلک میں تعلیم کی کمی ہے۔ عوام جاہل ہیں۔ وہ ذرا ذراسی بات پر مرنے اور مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں جاہل نہیں۔ میں مشرق و مغرب کے تمام علُوم کو جانتا ہُوں۔ میری سوچ کا انداز اِن لوگوں سے مختلف ہے لیکن

کیا کیا جائے کہ انہی لوگوں میں زندگی گزارنی ہے۔ لہٰذا ایسا کیا جائے کہ کسی کو لب گستاخی کی جرأت ہی نہ ہو۔"

"لیکن میں تو بے قصور ہوں۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ تم قصوروار ہو۔ قصور نہ تمہارا۔ نہ شہناز کا۔ قصور صرف ان لوگوں کا ہے جو انسانی فطرت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دیکھو بیٹا ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اس لئے احتیاط لازم ہے۔ اور ان تنگ نظر جاہلوں سے بچ کر رہنا ہی مناسب ہے۔ بیٹا اگر تم ذرا بھی احتیاط سے کام لیتے تو شور و غل اور ہنگامے سے بچ جاتے۔ وہ تو کہو کہ میں بروقت پہنچ گیا ورنہ سعید میاں کے ملازم تمہارا کیا حشر کرتے۔ اس حشر کا سارے محلّے کو علم ہوتا اور تمہارے گھر والے اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ چلو میں تمہیں گھر پہنچا دوں۔"

"جی نہیں آپ زحمت نہ کریں میرا گھر نزدیک ہی ہے میں خود چلا جاؤں گا۔"

"نہیں۔ میں تمہیں تنہا نہیں جانے دوں گا۔ پھر کوئی نوکر تمہارے ساتھ برا سلوک کرے گا۔"

میاں صاحب نے اوورکوٹ پہنا اور لڑکے کو لیکر گھر سے نکل گئے۔ راستے میں لڑکے کو تلقین کرتے رہے اور اسے گھر پہنچا دیا۔ واپسی میں وہ شہناز کے کمرے میں داخل ہوئے۔ شہناز باپ کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

"بیٹی شہناز! گھبراؤ نہیں۔ میں کوئی جبر و تشدّد کرنے نہیں آیا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی غلطی پھر نہ سرزد ہو۔"

"ابا جان یہ جھوٹ ہے۔ محض جھوٹ۔"

"ہاں جھوٹ ہی ہے۔ اگر سچ ہے تو بھی جھوٹ ہے۔ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ اسے جھوٹ سمجھیں۔"

میاں صاحب نے اپنی سہمی ہوئی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے تسلّی دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ اس کے بعد میاں صاحب اپنے بیٹے کے کمرے میں داخل ہوئے۔

سعید میاں صاحب کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میاں صاحب نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور گویا ہُوئے۔ بڑے بیوقوف ہو تُم سعید۔ میں نے تمہیں تعلیم دلائی انسانیت سیکھنے کے لئے لیکن آج معلُوم ہُوا کہ تم میں اور ایک بازاری آدمی کی سوچ میں کوئی فرق نہیں۔ بھلا اِس شور شرابہ اور ہنگامہ بپا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تمہاری تعلیم تمہیں حوصلہ اور بردباری نہیں دے سکتی تو اس تعلیم کا کیا فائدہ۔ یاد رکھو اس دُنیا میں قدم قدم پر ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے اِنسان کا مزاج برہم ہو سکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اِس کا بھی علم ہونا چاہیئے کہ تعلیم ہمیں آدمیت کا بھی درس دیتی ہے۔ اب ذی شعُور انسان ایسے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ یہ وحشی لوگوں کا کام ہے۔ تُم سوچو کہ اگر یہ فساد طول پکڑ جاتا تو کیا نتیجہ نکلتا سارا محلہ اکٹھا ہوتا۔ بدنامی اور جگ ہنسائی ہوتی۔ مل والوں سے ہمارے تعلقات خراب ہوتے۔ شہر کی گلی گلی میں چرچا ہوتا اور بات کہاں سے کہاں تک پہنچتی۔ مُجھے تمہاری کم عقلی سے بے حد صدمہ ہُوا۔"

"لیکن ابا جان وہ ہمارے زنان خانے میں کیوں آیا۔؟"

"آیا کہ نہیں آیا۔ میرا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اِس موقع پر بردباری سے کام لینا چاہیئے تھا۔"

"بردباری"۔؟

"ہاں! اِنسان کو بردبار ہونا چاہیئے۔ اگر اِنسان میں بردباری نہ ہو تو ایسے واقعات سے چشم پوشی کیسے کی جا سکتی ہے۔

دوستی

سرمایہ اپنے اندر بے حد کشش رکھتا ہے اس لئے سرمایہ دار کی ہر بات لبھاتی ہے۔ غریب کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے اوقات سرمایہ دار کی صحبت میں گزارے جب کسی مزدور کو کسی صاحب ثروت کی طرف سے دوستی کا پیغام پہنچتا ہے تو وہ اپنی سعادت سمجھتا ہے اور انتہائی خلوص کے ساتھ اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک سرمایہ دار ایسا نہیں ہوتا اور وہ اپنا کام نکل جانے پر ایسی آنکھیں پھیرتا ہے جیسے کبھی کی شناسائی ہی نہیں تھی۔ کوئی کھاتا پیتا انسان کسی فاقہ کش کو اپنے برابر کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا حالانکہ ایک فاقہ کش سرمایہ دار پر اپنی فاقہ کشی بھی قربان کر دیتا ہے۔

جہانگیر سیال اور صلابت خاں کے تعلقات بھی اسی قسم کی دوستی پر استوار تھے۔ جو ایک امیر اور غریب کے درمیان میں ہو سکتی ہے۔ دونوں نے ایک ہی گاؤں میں جنم لیا۔ دونوں ہم عمر تھے اور بچپن سے ایک دوسرے سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ دیہات کی پاک فضاؤں نے دونوں کو پروان چڑھایا اور دونوں ایک دوسرے کے ہمیشہ شریک رہے لیکن اس کے باوجود جہانگیر خان اور صلابت خاں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔

جہانگیر خاں ایک بہت بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ صلابت خاں صرف دس ایکڑ اراضی کا مالک۔ باوجود اس کے دونوں بچپن میں اکٹھا کھیلتے رہے اور عنفوان شباب میں صلابت خاں، جہانگیر خاں کی آوارگیوں میں شریک ہو گیا۔ لیکن صرف اس حد تک کہ جہانگیر خاں کی ڈھال ثابت ہو۔ جہانگیر خاں نے اسی آڑ میں آوارہ گردیاں شروع کر دیں۔ وہ گھوڑی پر بیٹھ کر دُور دراز کا سفر کرتا اور غریبوں کی بیٹیوں کی زندگیوں سے کھیلتا۔ جب غیرت دار غریبوں کی للکار کا سامنا کرنا پڑتا اور اُن میں گھِر جاتا تو صلابت خاں کو تنہا چھوڑ کر بھاگ آتا۔ صلابت خاں کئی بار اس مصیبت سے دوچار ہُوا اور کسی نہ کسی طرح سے جان بچا کر نکل آیا۔

جہانگیر خاں کے باپ کا انتقال ہو گیا جس کے بعد اُس نے اپنی تمام جائیداد کا انتظام صلابت خاں کے سپرد کر دیا۔ مزارعین سے بٹائی حاصل کرنا۔ اُنہیں زمین سے بیدخل کرنا اور اُن کی جگہ نئے مزارع رکھنا۔ صلابت خاں کے ذمے تھا۔

صلابت خاں، جہانگیر خاں کے اصطبل سے گھوڑا نکالتا اور اس پر تلے دار زین چڑھا کر کھیتوں میں پھیرا لگاتا تو اس کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگتا۔ اپنے اس اعزازی منصب کے تحفظ کے لئے صلابت خاں کاشتکاروں پر بلاوجہ سختی کرتا اور دن رات محنت کرنے پر مجبور کرتا۔ اس کے علاوہ صلابت خاں نے اپنے دوست کے لئے آمدنی کے لئے کئی اور راہیں کھول دی تھیں۔ دیہات کے دُور دراز علاقوں کے چور، اُچکے اور بدمعاش صلابت خاں کی معرفت جہانگیر خاں کو سلام کر جاتے اور جہانگیر خاں اُن کی اعانت کرتا۔

صلابت خاں کو ان بدمعاشوں کی سرگرمیوں کا پُورا علم ہوتا۔ وہ اپنے دوست کو ان سے باخبر رکھتا۔ اس لئے دیہاتوں میں نقب زنی یا مویشیوں کی گمشدگی کے سلسلے میں تفتیش کے لئے نکلتے تو جہانگیر خاں کی معاونت ضروری سمجھتے۔ جہانگیر خاں اپنے ڈیرے پر ایک نجی عدالت قائم کرتا اور فیصلے کرا دیتا۔ وہ جسے چاہتا سزا دلا دیتا۔ اور جسے چاہتا بری کرا دیتا۔ اس ملی بھگت میں تحصیل اور تھانے کے افسران برابر کے شریک تھے۔

جہانگیر خاں اور صلابت خاں کو اسی ڈگر پر زندگی بسر کرتے ہُوئے تیس سال گزر گئے۔ کئی بے گنُاہ مزارع اپنی کھڑی فصلیں چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ کتنے غریبوں کے گھروں میں نقب لگی۔ کتنوں کے اثاثے لُوٹے گئے اور کتنی معصوم بہو بیٹیوں کی عزتیں برباد ہُوئیں لیکن کوئی پرسانِ حال نہ ہُوا۔

جہانگیر خاں کے دونوں لڑکے جوان ہو گئے۔ اُنہیں اپنے گھر میں صلابت خاں کی یہ دخل اندازی ایک آنکھ نہ بھائی اور اُنہوں نے بیچ سے یہ کانٹا نکال لینے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ وہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے لگے اور غریبوں کی بیٹیوں کی عزّت سے کھیلنے لگے۔ اس کے علاوہ اپنے باپ کے کاموں میں مداخلت بھی کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جہانگیر خاں کی جائیداد کا نظام درہم برہم ہو گیا اور صلابت خاں کی وُہ ہیبت بھی ختم ہو گئی۔ جہانگیر خاں بڑھاپے کی وجہ سے اپنے لڑکوں پر قابُو نہ پا سکا۔ اور وُہ بے لگام گھوڑے کی طرح ہر طرف دندناتے رہے۔ صلابت خاں کا ایک کم عمر لڑکا اور ایک جوان لڑکی تھی جس کے ہاتھ پیلے کرنے کے لِئے رقم کی ضرورت تھی اور اپنے تعلّقات کی بنا پر چاہتا تھا کہ دیہات کے دوسرے زمینداروں کو مدعو کرے لیکن اس کے لِئے صلابت خاں کے پاس کُچھ نہ تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور جہانگیر خاں کے پاس آیا کہ وہ سات ہزار رُوپے کے عوض اس کی دس کیلہ زمین رہن رکھ لے لیکن جہانگیر خاں نے یہ معاملہ اپنے لڑکوں پر چھوڑ دیا۔ آخر ایک دن جہانگیر خاں نے صلابت خاں کو بلا کر کہا کہ اس کے لڑکے قرض دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ اپنی تمام اراضی ان کے نام بیع کر دے۔ جہانگیر خاں نے اُسے یہ بھی یقین دلایا کہ یہ بیع صِرف ایک فرضی معاہدے کی صُورت میں ہوگی۔ اور جب یہ رقم واپس ہو جائے گی۔ زمین منتقل کر دی جائے گی۔ صلابت خاں کو یہ بھی یقین دلایا کہ پیداوار وہی برداشت کرے گا اور اس کے وارث کبھی بیدخل نہیں کِیے جائیں گے۔

صلابت خاں یہ کڑی شرط سُن کر بھونچکا سا رہ گیا اور مایوس ہو کر واپس آ گیا جب

اسے ہر طرف سے ناکامی ہو گئی تو اُس نے سات ہزار پر اپنی اراضی جہانگیر خاں کے نام بیع کر دی۔ اس دُھوم دھام سے اپنی بیٹی کی شادی کی جس میں اُس کی خواہش کے مطابق تمام رؤسا وَ اُمراء شریک ہوئے۔

جہانگیر خاں نے اپنے ہاتھ سے دُلہن کا بازو پکڑ کر ڈولی میں سوار کیا۔ اور اپنی بیٹی کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وقت گزرتا چلا گیا اور صلابت خاں کی اولاد اپنی اراضی واپس نہ لے سکی۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد جہانگیر خاں کے بیٹوں نے صلابت خاں کی اراضی سے بٹائی کا مطالبہ کر دیا۔ اس نزاکت کا احساس اس کے دل کو تڑپانے لگا۔ اس نے اپنی تو بیاہتا بہُو کے زیور اور مویشی بیچے اور کچھ اِدھر اُدھر سے حاصل کر کے جہانگیر خاں کے پاس پہنچا لیکن اُس نے اپنی علالت کا عُذر کر کے مُلاقات سے انکار کر دیا۔ اور اپنے لڑکے کے پاس بھجوا دیا۔ لیکن اس کے بیٹوں نے اسے زمین دینے سے انکار کر دیا۔

صلابت خاں نے شہر جا کر دیوانی مقدمہ دائر کر دیا اور مقدمے کی طوالت نے اُسے اور بھی قلاش کر دیا۔ جہانگیر خاں کے بیٹوں نے اُسے اپنی ہتک سمجھی اور صلابت خاں کی بیدخلی کے آڈر لے لئے۔ آخر کڑکڑاتی ہوئی سردی کی ایک صُبح کو پولیس کے سپاہی اور محکمہ مال کے مُلازمین نے صلابت خاں کا سامان باہر پھینک دیا۔ اور اسے مکان سے بیدخل کر دیا۔

وہ صلابت خاں جس کی آج سے کچھ عرصہ پہلے گاؤں میں ہیبت بیٹھی ہُوئی تھی سردی میں کھڑا ریڑھے پر اپنا سامان لدوا رہا تھا۔ کچھ دیر میں یہ مختصر سا قافلہ منزلِ بے نشاں کی طرف روانہ ہو گیا اور یُوں صلابت خاں کی دوستی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

شاپنگ

انارکلی کے بازار کی سب سے بڑی ایک دکان کے باہر لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس انبوہ کثیر کی وجہ سے موٹر گاڑیوں کی دو رویہ قطار سے آمد و رفت بھی مسدود ہو گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ دکان میں ایک خاتون اور سیلز مین میں جھگڑا ہو رہا ہے اور لوگ کھڑے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ "میں کہتی ہوں میں تمہیں پچاس روپے کا نوٹ دے چکی ہوں۔ سوئٹر کے چالیس روپے کاٹ کر دس روپے فوراً میرے حوالے کر دو۔" اس خاتون نے سیلز مین سے کہا۔

"بیگم صاحبہ آپ بھول رہی ہیں۔ آپ نے مجھے پچاس روپے کا نوٹ نہیں دیا۔"

"میں نے ابھی پرس سے نکال کر تمہیں پچاس روپے کا نوٹ دیا ہے تم غلط بیانی سے کام نہ لو۔"

"غلط تو آپ کہتی ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے پچاس روپے دیں اور میں دوبارہ طلب کروں۔"

"خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔ میں ایک غریب عورت ہوں۔ میں نے ابھی تمہیں پچاس روپے دیئے ہیں۔ تم نے وہ نوٹ میرے سامنے کیش بکس میں ڈالا ہے۔ ہائے ہائے کیسا

زمانہ آگیا ہے۔ اپنے ایمان سے کہو کہ تم نے مجھ سے پچاس روپے نہیں لئے۔"

"بی بی! یہ کیا کہہ رہی ہو۔ ادھر لاؤ ہمارا سوئٹر۔"

دکان کے اندر اور باہر لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دکان میں کوئی ناٹک ہو رہا ہے اور جیسے لوگ دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہے ہوں۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ مجمع سے ایک خوش پوش نوجوان نکلا اور دکان میں داخل ہو کر خاتون سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

کیا معاملہ ہے بیگم صاحبہ!

"معاملہ یہ ہے کہ میں نے یہ سوئٹر چالیس روپے کا خریدا۔ بل بنوا کر کاؤنٹر پر آئی اور پچاس روپے کا نوٹ دیا لیکن یہ شخص منکر ہو رہا ہے۔ خدا کا قہر نازل ہو۔ ایک دو نہیں پورے پچاس روپے کا معاملہ ہے۔"

بات تو تو میں میں تک آ پہنچی تھی اور یہ خوش پوش نوجوان مصالحانہ کردار ادا کرنے ہی والا تھا کہ مجمع کو چیرتے ہوئے ایک منحنی سے بزرگ دکان میں داخل ہو گئے اور دونوں فریقوں سے معاملے کی توضیح چاہی قبل اس کے کہ دونوں فریق ان بزرگ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتے کہ دو پاسدارانِ امن باوردی دکان میں گھس آئے اور اپنی چھڑی مجمع پر برسا کر کڑک دار آواز میں پوچھنے لگے۔

یہ کیا شور و غل ہے۔؟

"جناب اس عورت نے مجھے پچاس روپے نہیں دیئے اور کہتی ہے کہ دیدیئے۔ آپ ذرا خود سوچیں کہ دکاندار بھی بے ایمانی کر سکتا ہے۔؟"

"کیوں نہیں کر سکتا۔ تم میرے ساتھ بے ایمانی نہیں کر رہے ہو تو اور کیا کر رہے ہو۔" بیگم صاحبہ نے بسورتے ہوئے کہا۔

"کیا تم قسم کھا کر کہتی ہو کہ تم نے پچاس روپے کا نوٹ دیا ہے۔"

پُولیس کے لوگوں نے دونوں کو بغور دیکھا اور جاننے کی کوشش کی لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ حق پر کون ہے۔

بی بی آپ تبلائیے کیا معاملہ ہے؟

"جناب عالی! مَیں نے اِس شخص کو پچاس رُوپے کا نوٹ دیا اور یہ پچاس رُوپے لیکر مُکر رہا ہے۔ مَیں نے یہ سوئٹر چالیس رُوپے میں خریدا اور دس رُوپے اسے لوٹانا تھے۔ لیکن کہہ رہا ہے کہ مَیں نے اسے نوٹ نہیں دیا۔"

"نہیں جناب! انہوں نے مجُھے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ اگر یہ رقم دیتیں تو پرچی کاٹ کر اِن کے حوالے کر دی جاتی۔ سوئٹر ابھی ان کے ہاتھ میں ہے اور یہ اس کا ثبوُت ہے کہ اُنہوں نے کوئی رقم نہیں دی۔"

"لیکن یہ کہتی ہیں کہ مَیں نے پچاس رُوپے کا نوٹ دیا ہے اور تم کہتے ہو کہ مَیں نے نہیں لیا۔ یہ ثبوت تو کوئی نہیں کہ ان کے ہاتھ میں سوئٹر ہے۔"

معاً بیگم صاحبہ نے تڑپ کر کہا۔ میرا خاوند کلرک ہے اور نو سو تنخواہ ہے۔ میرا ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔ ہم تین آدمیوں میں یہ رقم اس زمانے میں ناکافی ہے۔ اس لیئے ہم ایک ایک پیسہ گن کر خرچ کرتے ہیں۔ جس کا ہم اپنے پاس حساب رکھتے ہیں۔ جناب عالی اس نے تو اپنا ثبوُت آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ اب میں اپنا ثبوت پیش کرتی ہُوں۔

"وہ کیا ثبوت ہے؟" پُولیس افسر نے استعجاب سے پُوچھا۔

بیگم صاحبہ نے اپنے بیگ سے ایک نوٹ بُک نکالی اور نقاب کے اندر اوراق اُلٹ پلٹ کر کے فاتحانہ انداز میں گویا ہُوئیں ہماری تنخواہ جو مہینے میں وصُول ہوتی ہے اس کے جس قدر نوٹ ہمیں مِلتے ہیں ان کے نمبر نوٹ کر لیتی ہُوں۔ چُنانچہ اس نمبر کا نوٹ مَیں نے دکاندار کو دیا ہے اگر اس کے کیش سے یہ نوٹ نِکل آئے تو میں حق پر اگر نہ نِکلے تو جو سزا بھی میرے لئے تجویز کریں۔ مجُھے قبوُل ہے۔"

یہ ثبوت انتہائی ٹھوس تھا اور اس کی تائید سب نے کی تھانیدار صاحب کو بھی اس تجویز سے اتفاق ہوا اور اس نے دکاندار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

" مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ ان کے نمبر کے مطابق میرے کیش بکس سے مطابقت کر لیں۔"

تھانیدار نے خاتون سے نوٹ کا نمبر لیا اور کیش بکس سے پچاس روپے کے نوٹ نکال کر نمبر ملانا شروع کر دیئے۔ یک بیک تھانیدار نے ایک نوٹ نکال کر ہوا میں لہرایا اور بہ آواز بلند پکارا۔

" یہ رہا وہ نوٹ"

مجمع میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور دکاندار پر شرم سے گھڑوں پانی پھر گیا۔ چاروں طرف سے دکاندار پر لعن طعن ہونے لگی اور خاتون کی ایمانداری کی تعریف۔

" دیکھ لیا تم نے یہ وہی پچاس روپے کا نوٹ ہے نا جس کا نمبر خاتون نے بتایا تھا۔ اب کیا جواب ہے تمہارے پاس ؟" تھانیدار نے غصّہ سے دکاندار سے پوچھا۔

" میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ نمبر اِن کے پاس کہاں سے آگیا۔ بہر حال اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس عورت نے مجھے پچاس روپے کا نوٹ نہیں دیا۔"

رائے عامہ دکاندار کے خلاف ہو چکی تھی اور ہر طرف سے شرم کرو شرم کرو کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تھانیدار نے دکاندار کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھ کر فرمایا۔

" تم بکواس کرتے ہو۔ تم نے بے ایمانی کی ہے۔ تم اگر سلامتی چاہتے ہو تو ان کے پیسے دے دو اور دیکھو آئندہ اس قسم کی کوئی حرکت کی تو دھر لیئے جاؤ گے۔"

دکاندار نے چار و نا چار خاتون کو دس روپے دے کر رسید کاٹ دی اور خاتون مجمع کے ساتھ اس طرح دکان سے نکل گئیں جیسے بھونچال کے وقت لوگ اپنے گھر سے نکلتے ہیں۔

وہ لمبے لمبے قدم اُٹھاتی بازار کے جنوب کی طرف روانہ ہو گئی اور بائیں طرف مڑ کر نیلے گنبد کے قریب انتظار کرتی ہوئی ایک عورت سے جا ملی۔

" رضیہ میرا کام ہو گیا ہے۔ میں یہ سوئٹر بھی لے آئی ہوں اور دس روپے بھی۔"

دیکھو یہ سوئٹر تم رکھو لیکن دس روپے مجھے دے دو کیونکہ اگر میں تمہیں نوٹ کا نمبر نہ لکھا دیتی تو تم یہ ڈرامہ نہیں کھیل سکتی تھیں۔"

خاتون نے اپنی کامرانی پر قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔

"سوئٹر بخشنے کا شکریہ۔ رہا دس روپیوں کا سوال تو یہ نہ تمہارے نہ ہمارے۔ اِس سے دونوں پکچر دیکھیں گے۔"

یہ دونوں سہیلیاں سینما کی طرف روانہ ہوگئیں اور قصّہ اس مقولے پر ختم ہوگیا۔

سچ ہے محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔

رقص و نغمہ بنام زہد و تقویٰ

ملک و قوم کے یہ دونوں مایہ ناز سپوت ایک ہی شہر میں سکونت پذیر تھے اور دونوں کی شہرت آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔

حاجی صاحب پارسائی میں منفرد۔ عبادت گزار۔ شب بیدار۔ شرعی احکام کے پابند متشرع۔ چہرے پر نور۔ مذہبی تحریکوں کے سرگرم کارکن۔ ان اوصاف کے علاوہ وزراء اور اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں میں انتہائی مقبول اور با اثر تھے۔

دینی درسگاہوں اور دوسری تعلیمی درسگاہوں سے دلچسپی اور اُن میں تعلیم پانے والے نوعمر طلباء سے خصوصی لگاؤ تھا اور یہی لگاؤ حاجی صاحب کو بام عروج پر لے گیا۔ جہاں لوگوں کے چندوں سے اُنہوں نے درسگاہیں تعمیر کروائیں وہاں اپنا ایک عالیشان بنگلہ بھی۔ اس کا ایک اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے ارباب بست و کشاد۔ اعلیٰ افسران۔ جاگیردار اور علمائے کرام کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ضیافتیں مشغلہ بن گئیں۔ یہ سب کچھ آخر قوم کے نونہالوں ہی کی خاطر تو کیا جا رہا تھا تاکہ اُن کے مستقبل کو روشن و تابناک بنایا جا سکے اور اعلیٰ حکام سے سفارش کر کے ملازمت کے کسی اچھے عہدے پر فائز کیا جا سکے اور جس کا حقِ محنت وصول کیا جا سکے۔

اِسی شہر کی ایک مشہور مغنیہ جس کا شمار ملک کی صفِ اوّل میں ہوتا تھا اور جس کے نغمے زبان زدِ خاص و عام تھے۔ محفلِ رقص و سرود میں جس پر اُمراء اپنی دولت نچھاور کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایک دِن اُسے حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری دینا پڑی اور وُہ بنگلہ جو حاجی صاحب فروخت کر رہے تھے خریدنے کا اشتیاق ہُوا۔ حاجی صاحب نے اپنے وظائف میں مشغولیت کی بنا پر اُسے ذرا دیر سے شرفِ قبولیت بخشا۔ مغنیہ کے بنگلے کی خریداری کی خواہش کے جواب میں حاجی صاحب نے فرمایا۔

"دیکھئے محترمہ! میں اِس کا پانچ لاکھ رُوپیہ لُوں گا۔ اگر آپ کو منظور ہو تو مجھے پچاس ہزار پیشگی دے جائیں اور بعد میں رجسٹری کرا لیں"۔

مغنیہ نے ادب سے عرض کی۔

"قبلہ حاجی صاحب یہ رقم تو بہت زیادہ ہے۔ اگر آپ کُچھ رعایت فرما دیں تو مہربانی ہوگی"۔

نہیں محترمہ! اس سے ایک کوڑی کم نہیں ہو سکتی"۔

یہ کہہ کر حاجی صاحب اُٹھ کھڑے ہُوئے اور حُجرۂ عبادت کی طرف جانے لگے لیکن مغنیہ نے اُنہیں لجاجت سے روکا۔

"مجھے یہ رقم منظور ہے اور مَیں آپ کو پچاس ہزار پیشگی بھی دینے کو تیار ہُوں"۔

"محترمہ میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔ مجھے کُچھ نوافل ادا کرنا ہیں۔ اگر پانچ لاکھ رُوپے منظور ہیں تو کل صُبح دس بجے تک یہیں پچاس ہزار رُوپے دے جائیے گا"۔

اتنا کہہ کر حاجی صاحب اپنے حُجرہ میں چلے گئے۔ مغنیہ اس سودے سے خُوش تھی کیونکہ اس کی نظر میں یہ بنگلہ پانچ لاکھ سے کم کا نہ تھا۔ اور یہ کہ یہ بنگلہ ایک سینما کی صُورت میں تبدیل ہو کر آمدنی کا بہترین ذریعہ ثابت ہو گا۔ اور جس کی منظوری وہ آسانی سے کرا لے گی۔

دُوسرے دن مغنیہ حاجی صاحب کی خِدمت میں حاضر ہُوئی اور پچاس ہزار رُوپے کا چیک پیش کیا۔ حاجی صاحب برہم ہو گئے اور فرمانے لگے میں روزے سے ہُوں اور مسلسل

تین روز سے اور رکھوں گا۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ میں بینکوں کے چکّر لگاتا رہوں۔ آپ مجھے نقد رقم دیں۔"

"بہت اچھا! میں بینک سے پیسے لے کر ابھی آتی ہوں۔"

"آپ گیارہ بجے سے پہلے آجائیں ورنہ میں نہیں ملوں گا۔"

مغنیہ تھوڑی دیر میں روپے لیکر حاضر ہو گئی اور حاجی صاحب کو پیش کر دیئے۔ حاجی صاحب نے مری سے واپسی پر بیع نامے کا وعدہ کیا اور اُٹھ کر چلے آئے۔ مری سے واپسی پر مغنیہ ایک وثیقہ نویس کو لیکر حاجی صاحب کے پاس پہنچی۔ حاجی صاحب نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور مغنیہ سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔

"محترمہ یہ بنگلہ آپ از سر نو تعمیر کرائیں گی یا اِسی شکل میں برقرار رکھیں گی۔ آپ کو یہ بنگلہ خریدنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔"

"میرا ارادہ ہے کہ میں یہاں سینما تعمیر کراؤں گی۔"

سینما؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں جہاں تیس سال عبادت کرتا رہا وہاں آپ فحاشی کا اڈّہ بنائیں گی۔"

"میں کچھ بھی کروں۔ آپ کا ہمارا سودا ہو چکا ہے۔ آپ پچاس ہزار پیشگی بھی لے چکے۔"

"وہ پچاس ہزار عنقریب آپ کو واپس کر دوں گا۔ لیکن اپنے بنگلے پر سینما کبھی نہیں بننے دوں گا۔"

حاجی صاحب برہمی کی حالت میں اندر چلے گئے۔ مغنیہ اور وثیقہ نویس مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ اس کے بعد مغنیہ نے حاجی صاحب کے دولتکدے پر کئی چکّر لگائے لیکن رقم کی واپسی تو درکنار حاجی صاحب کا دیدار بھی نصیب نہ ہُوا۔

مغنیہ کے پاس کوئی ثبوت اور چشم دید گواہ نہ تھا۔ اس لیئے اسے مجبوراً خاموش ہونا پڑا اور حاجی صاحب یوں آسانی سے اس کی رقم ہضم کر گئے۔

ماحول

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ شکار کے دوران میں اپنے لشکر سے الگ ہوگیا اور بصد تلاش اسے لشکر نہ ملا۔ جنگل اور پھر برفانی ہوائیں اس کے حواس باختہ کر رہی تھیں۔ وزیر نے کہیں دُور آگ جلتے ہوئے دیکھی اور بادشاہ کو وہاں شب بسری کا مشورہ دیا۔

تھکا ماندہ بھوک اور جاڑے سے نڈھال بادشاہ وزیر کے گھوڑے کے پیچھے گھوڑا اڑائے آگ کی طرف روانہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں دونوں ایک جھونپڑی میں پہنچے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ایک دہقان اور اس کی خُوبرو اور جوان لڑکی آگ جلائے ہاتھ تاپ رہے ہیں۔ دہقان اور اُس کی لڑکی کو جب علم ہُوا کہ اس کی جھونپڑی میں بادشاہ مہمان ہیں تو دونوں کی خُوشی کی کوئی انتہا نہ رہی وہ بادشاہ کے لیئے ایک بڑی چارپائی لائے اور اُسے عزّت کے ساتھ بٹھا دیا۔ اس کے بعد دُودھ گرم کر کے پلایا اور ایک بکری ذبح کر کے پکائی اور حسبِ مقدور بادشاہ کی ضیافت کی۔ بادشاہ اپنے شاہی کھانوں سے زیادہ اس سادہ کھانے سے لُطف اندوز ہُوا اور رات آرام سے بسر کی۔

بادشاہ کی نظر دہقان کی اس لڑکی پر پڑی جو لالۂ صحرائی کی مانند تھی۔ بادشاہ کو وہ پسند آئی اور اپنے وزیر سے اپنے دل کی خواہش بیان کی۔ وزیر نے دہقان کو الگ لیجا کر بادشاہ کی خواہش بیان کر دی۔ دہقان پہلے تو حیرت زدہ ہُوا لیکن بعد میں اُس کی مسرّت کی کوئی انتہا

نہ رہی اور خُوشی خُوشی بادشاہ کے قدموں میں جا کر بیٹھ گیا۔ حضُور جو کچھ مجھ سے وزیر نے کہا ہے اس کا مجھے یقین نہیں آتا۔ آپ اِس ملک کے بادشاہ ہیں اور مَیں آپ کی رعایا۔ کہاں میری لڑکی اور کہاں آپ۔ آپ سے میری لڑکی کا رشتہ کیسے ہو سکتا ہے"؟

بادشاہ نے محبّت سے مُسکرا کر کہا۔

" بڑے میاں! بادشاہ بھی ملک کا ایک فرد ہوتا ہے اور مُلک میں رہنے والے تمام افراد برادری کے رشتے میں منسلک ہیں۔ تمُہاری لڑکی سے میرا عقد طبقاتی فرق کو مٹانے کی ایک بہت بڑی مثال ثابت ہو گا"۔

" بادشاہ سلامت! مَیں ایک غریب آدمی ہُوں اور یہ رشتہ آپ کے شایانِ شان نہیں"۔

" میں فضول باتیں نہیں سُننا چاہتا۔ تُم ابھی جاؤ اور کسی قاضی کو بلا لاؤ"۔

شاہی حُکم کی تعمیل کی گئی۔ اور دہقاں نے اپنی لڑکی کی شادی خُوشی خُوشی بادشاہ سے کر دی۔ بادشاہ کی بھی وُہ رات اِنتہائی رُوح افزا اور پُرکیف گزُری۔ علیٰ الصباح بادشاہ کو تلاش کرتے اُس کے ساتھی پہنچ گئے اور بادشاہ اپنی نوبیاہتا دُلہن کو یقین دلا کر رخصت ہو گیا کہ وہ اپنے محل میں پہنچنے کے کُچھ ہی عرصہ کے بعد باقاعدہ بارات لائے گا اور تزک و احتشام سے ایک ملکہ کی حیثیت سے قصرِ حکُومت لے جائے گا۔ دُلہن نے اپنے شوہر کو نمیدہ آنکھوں سے رُخصت کیا۔ اور ایک اُونچی پہاڑی پر چڑھ کر بادشاہ کے جاہ و جلال کا منظر دیکھنے لگی۔

دہقان کی یہ لڑکی ہر صُبح اسی پہاڑ پر چڑھ کر اسی شان و شوکت کے ساتھ بارات کا اِنتظار کرتی اور شام کو مایُوس ہو کر لَوٹ آتی۔ اور وُہ صُبح نہیں آئی یہاں تک چھ ماہ گزُر گئے آخر ایک دِن لڑکی نے باپ کو مجبُور کیا کہ وُہ اسے راجدھانی لے جا کر خاوند کے پاس چھوڑ آئے۔ غریب کِسان بیٹی کے اِصرار پر اپنا مختصر سا زادِ سفر باندھ کر بیٹی کو ساتھ لیکر روانہ ہو گیا۔

کافی مُسافت طے کرنے کے بعد باپ بیٹی منزلِ مقصُود پر پہنچے اور اپنی آمد کی اِطلاع بادشاہ کو پہنچائی۔ دو دِن کے اِنتظار کے بعد شرفِ باریابی مِلا۔ کُھلے دربار میں کُھردرے اور میلے کپڑوں

میں بوڑھا دہقان ایک لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوا فرمانروائے وقت کو اس رات کی یاد دلا رہا تھا۔ جب شکوہ سکندری اس کے ویران جھونپڑے میں پناہ لینے کی غرض سے متمکن تھا۔ بادشاہ نے دہقان کے علاوہ اپنی اس دُلہن کو بھی پہچانا جو سر سے پاؤں تک ایک چادر میں لپٹی کھڑی تھی۔ بادشاہ نے ان دونوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور دونوں کو انعام و اکرام سے نوازنے کا حکم صادر فرمایا۔ لیکن لڑکی نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس نے بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی جرأت سے کہا۔

"بادشاہ سلامت! آپ کو وُہ رات یاد ہے جب آپ ہمارے مہمان تھے اور آپ نے میرے ساتھ وہ رشتہ قائم کیا تھا جو ایک میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے"۔ مجمع پر ایک سکوت طاری ہو گیا اور بادشاہ کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ دہقان نے آبدیدہ ہو کر ایک نظر اپنی بیٹی پر ڈالی اور بادشاہ سے کچھ مخاطب ہونا چاہتا ہی تھا کہ اُس چالاک وزیر نے۔ جو اس وقت بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ نزاکتِ وقت کا احساس کیا اور دہقان کی لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"دیکھو! بادشاہ کا کام ہے شکار کرنا۔ اسے جو اچھا لگتا ہے شکار کر لیتا ہے۔ اُس جنگل میں ہمارے بادشاہ سلامت کو تُم سے اچھا ہرن نہیں مِلا اِس لیئے تُمہارا شکار کر لیا۔ یہ دربارِ شاہی ہے یہاں گستاخی قابلِ معافی نہیں۔ خیریت اِسی میں ہے کہ اِسی جنگل میں لَوٹ جاؤ"۔

دہقان کا یہ زخم خوردہ ہرن جسے بادشاہ نے اپنے تیرِ ہوس سے شِکار کیا تھا اپنے جنگل کی طرف لَوٹ آیا اور زندگی بھر اس کے زخم مندمل نہیں ہو سکے۔

گلباز خان

نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ جاڑے کی ایک خنک صبح کو میں قلعہ ابنِ قاسم باغ کی طرف چل پڑا۔ قلعہ ویران دکھائی دے رہا تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ میں سیرگشت کرتا ہُوا اس طرف جا نکلا جہاں صُوفیائے کرام کے سربفلک روضوں کے مینار اس دیرینہ روحانیت کے گواہ ہیں۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک خانقاہ کے قریب آگ جل رہی ہے اور اس میں چند بے فکرے جمع ہیں اور ایک خاص شئے سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں۔ مَیں جا کر ان کی محفل میں کھڑا ہو گیا۔ اُنہوں نے مجھے کھڑا دیکھ کر آگ کے قریب بیٹھنے پر اصرار کیا۔ میرے بیٹھنے کے بعد مجھے بھی اِس میں شامل کرنے کی کوشش کی جس سے وہ شغل کر رہے تھے لیکن مَیں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ میرا اس دُھوئیں اور بدبُو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ مَیں نے اس شخص سے جو ان لوگوں میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ سوال کیا۔

"خان صاحب! کیا اس چیز کا بیچنا اور خریدنا جُرم نہیں؟ یہ بتائیے کہ لوگ اسے کیسے حاصل کر لیتے ہیں؟"۔

"یہ دونوں صُورتیں بالکل مُشکل نہیں۔ یہ تانگے والوں۔ لاریوں کے اڈے اور سگریٹ فروشوں کے پاس آسانی سے مِل جاتی ہے۔"

"کتنے سگریٹ پینے سے نشہ آجاتا ہے؟"

"اس کا پہلا ہی کش دُنیا وَ مافیہا سے غافل کر دینے کے لئے کافی ہے۔ یہ نوآموز لوگوں کی بات کر رہا ہوں اور ہم جیسے عادی لوگوں پر تو کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔"

"خانصاحب! اس کا صحت پر تو بُرا اثر پڑتا ہے۔"

صحت پر کچھ نہ کچھ تو اثر پڑتا ہے لیکن یہ دیکھئے کہ رُوح کو کتنی تقویّت پہنچتی ہے، تقویت پہنچنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ بے ضرر ہو جاتا ہے اور وُہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ کیا یہ مدہوش اس ہوش مند سے اچھا نہیں جو لوگوں کی بہو بیٹیوں کی عزّت کے درپے ہوتا ہے۔ آپ کو میں یہ بھی بتا دوں کہ یہ اِن لوگوں کا عطا کردہ ہے۔ جنہوں نے ہمیں کسی نہ کسی طرح دُکھ پہنچایا۔ کسی نے ملازمت نہیں دی۔ کسی نہ ہماری بیٹی اغوا کی اور داد رسی نہ سُنی گئی۔ کسی نے ہمارے خوانچے سڑک سے اُٹھوا دیئے۔ کسی نے ہماری مجبوری سے فائدہ اُٹھایا۔ کسی نے ہماری مزدوری ہضم کر لی اور کسی نے ہمیں ہمارے مکان سے بیدخل کر دیا۔ اِن غموں کو بھلانے کا صِرف یہی ایک راستہ ملتا ہے۔ جِسے ہم لوگ اِختیار کر لیتے ہیں۔ لوگ ہمیں نشئی، بدمعاش اور آوارہ تو کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے اندر جھانک کر دیکھتے نہیں کہ اس جُرم کے اسباب کیا ہیں۔ پھر ہم غم کے ماروں میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور ہم ان گھروں میں بھی اسے پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں سے ہمیں غم ملے۔ ہم ان کے بچوں کو عادی بنا دیتے ہیں۔ ان جوان لڑکیوں کے چہروں کی سُرخی کو مٹی کے رنگ میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اُن کی جائیدادیں آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں اور وہ ہماری غربت کا مذاق اُڑانے کے قابل نہیں رہتے۔ یہ تو انتقام اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کرنے کا ذکر ہے۔ جو ہمیں اپنا ہم وطن نہیں سمجھتے۔ اب آپ خُود انصاف سے بتائیے کہ انگریزوں نے ہمارے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ اگر غور کیجئے تو معلُوم ہو گا کہ یہ لعنت اُنہوں نے ہی ہمیں دی ہے۔ اگرچہ صُورتیں مختلف تھیں۔ افیون کے بعد چرس اور اس کے بعد چرس کو ہیروئن کی شکل میں بدل دیا اور یہ محض اِس لئے کہ پاکستانی قوم

بیکار ہو جائے اور اس میں شعور باقی نہ رہے لیکن ہم نے اِن سے بھی انتقام لیا اور انہی کی عطا کردہ لعنت کو انہی تک پہنچانا شروع کر دیا۔ جب وُہ اس لعنت سے دوچار ہُوئے تو چیخ اُٹھے اور ہم پر زور دینے لگے کہ اِسے ہمارے مُلک میں نہ پہنچایا جائے لیکن ہم کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچا دیتے ہیں اور وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اِس سے ہمارا ایک فائدہ تو یہ ہُوا کہ ہم نے کچھ نہ کچھ ان کی دشمنی کا بدلہ لے لیا اور دُوسرا فائدہ یہ ہُوا کہ ایک رُوپیہ کے سو رُوپے کماتے ہیں۔"

" خان صاحب! آپ کے انتقام کا انداز تو اچھا ہے لیکن یہ بتایئے کہ اس وقت جو آپ کی مجلس میں بیٹھے ہیں انہوں نے آپ پر کیا ظلم کیا ہے۔ آپ اِن پر کیوں ظلم کر رہے ہیں اور آپ نے اِنہیں ہیروئن کا کیوں عادی کر دیا ہے۔؟"

میری اتنی بکواس شاید آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ سب ستم رسیدہ ہیں اور کسی نہ کسی طرح سے ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور غم غلط کرنے کا صاف یہی ایک طریقہ ہے۔

" اچھا خان صاحب! یہ بتلایئے کہ ہیروئن آتی کن علاقوں سے ہے؟"

ہیروئن کابل اور سوات کے راستوں سے کسی بھرے ہُوئے مال کے ٹرک میں چھپا کر اِس کے علاوہ اور بہت سی صُورتیں ہیں جنہیں مَیں آپ کو کیا بتاؤں۔

کچھ تو بتائیں!

جناب! زیادہ بڑے آدمیوں کی کاروں میں بڑے بڑے تاجروں کے کپڑوں کے تھانوں میں۔ قالینوں بنڈلوں میں۔ فروٹ کی پیٹیوں میں۔ خواتین کے برقعوں میں۔ بچّوں کے کھلونوں میں وغیرہ وغیرہ۔

" اگر ہیروئن راستے میں پکڑی جائے تو۔؟"

تو کیا! ڈرائیور فرار ہو جاتا ہے اور اگر پکڑا بھی جائے تو جیبیں گرم کر کے ٹرک

آگے روانہ ہو جاتا ہے ورنہ دو تین ماہ کی جیل کاٹ کر اپنے گھر آجاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے بلکہ ایسا زیادہ ہوتا ہے کہ ایک کیلو ہیروئن کو کچھ تولے ظاہر کر کے پھر پکڑنے والے فروخت کر دیتے ہیں۔"

"اچھا انکشاف ہے خان صاحب! اچھا یہ بتلایئے کہ آپ ان لوگوں سے اِنتقام لے رہے ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ زیادتیاں کی ہیں لیکن یہ کالجوں کے لڑکوں نے آپ کا کیا قصور کیا ہے"۔

"بڑے بھولے ہیں آپ۔ یہ لڑکے بھی تو انہی سرمایہ داروں کے ہیں۔ کیا آج کل کالج میں کسی غریب کا لڑکا تعلیم حاصل کر سکتا ہے؟"۔

مَیں خان صاحب کے طریقۂ انتقام سے مبہوت ہو گیا اور اس کے استدلال کو غور سے سوچنے لگا۔ پھر یک بیک میرے ذہن میں سوال آیا اور مَیں نے اُس سے کہا۔

"خان صاحب! معافی بھی تو ایک بہت بڑا ثواب ہے۔ آپ یہ طریقہ ختم کر کے ان لوگوں کو مُعاف بھی تو کر سکتے ہیں"۔

"معاف! کتنا بھونڈا اور مہمل لفظ ہے۔ ہم ان لوگوں کو مُعاف کر دیں جنہوں نے ہمیں یہ لعنت دی اور ہماری نسلیں ختم کر دیں۔ ہم نہ کسی کام کاج کے رہے اور نہ ہماری اولاد زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو سکی۔ پھر ہم کیوں نہ اُنہیں ان نعمتوں سے محروم کریں۔ ہم تو ہو ہی گئے برباد"۔

یہ کہہ کر ہیروئن کا اس نے بڑا سا دم لگایا اور مُجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"لیجئے آپ بھی ایک دم لگایئے پھر دیکھئے مزہ"۔

"مُجھ سے کس بات کا انتقام لے رہے ہو۔؟"

"اِس لئے کہ آپ بھی انہی دولت مندوں میں سے معلوم ہوتے ہیں"۔

مَیں اس کے اس جُملے سے کانپ گیا اور جلدی سے اس کی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

مصنف